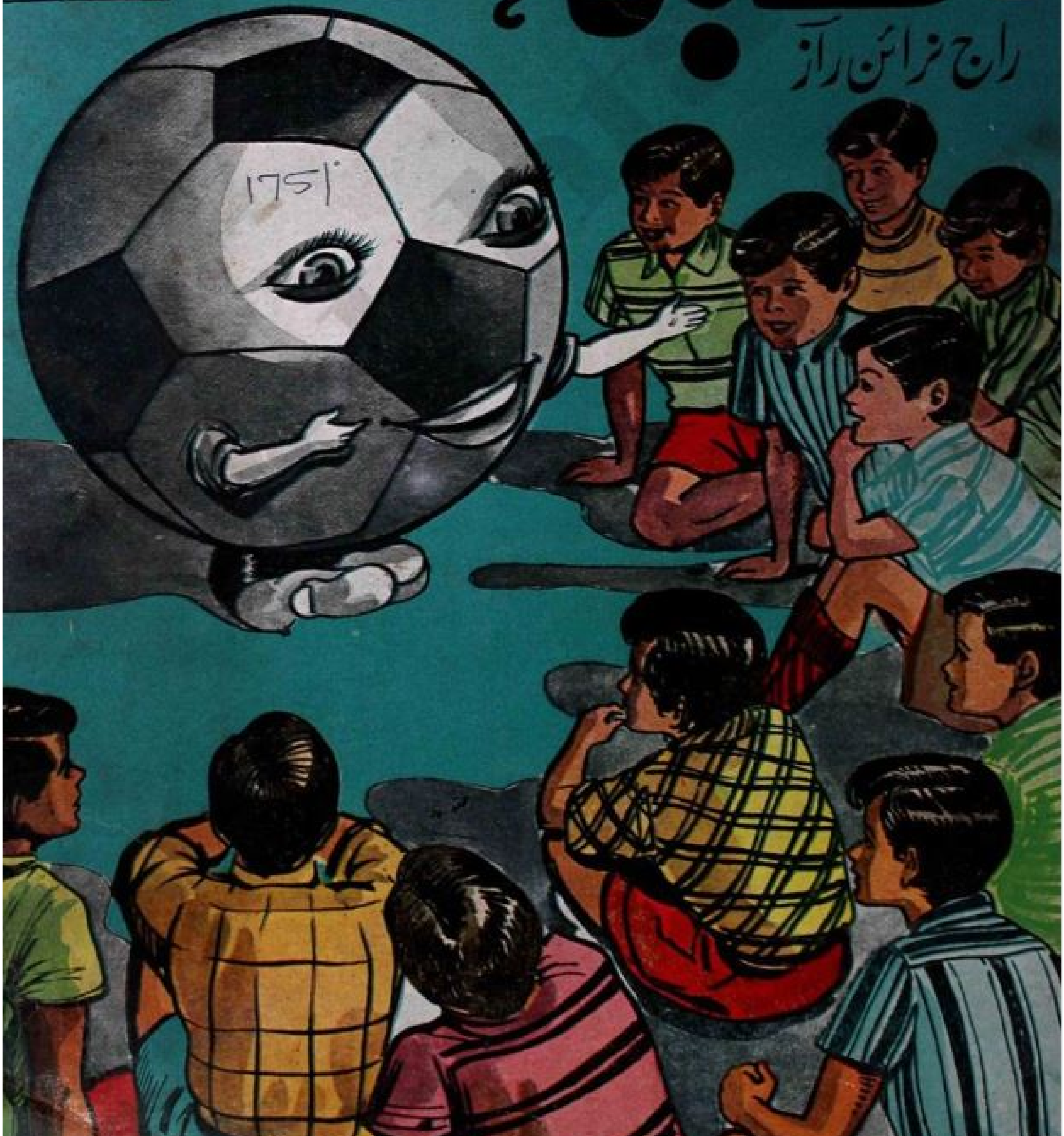
فٹ بال کی کہانی

راج نرائن راز



ترقی اردو بورڈ کی کتاب

فٹ بال کی کہانی

مصنّف
راج نرائن راز

نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا

پہلا ایڈیشن
1977 (1898)

FOOTBALL KI KAHANI
by
RAJ NARAIN RAZ
(URDU)

قیمت : 6/-
تقسیم کار
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر نئی دہلی 110025، اُردو بازار دہلی 110006
پرنسس بلڈنگ بمبئی 400003، یونیورسٹی مارکیٹ علی گڑھ 202001

ڈائرکٹر نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا A/5 گرین پارک نئی دہلی 110016 نے
ترقی اردو بورڈ (مرکزی وزارتِ تعلیم اور سماجی بہبود، حکومتِ ہند) کے لیے

والدہ
مرحومہ
کے
حضور
میں

پیش لفظ

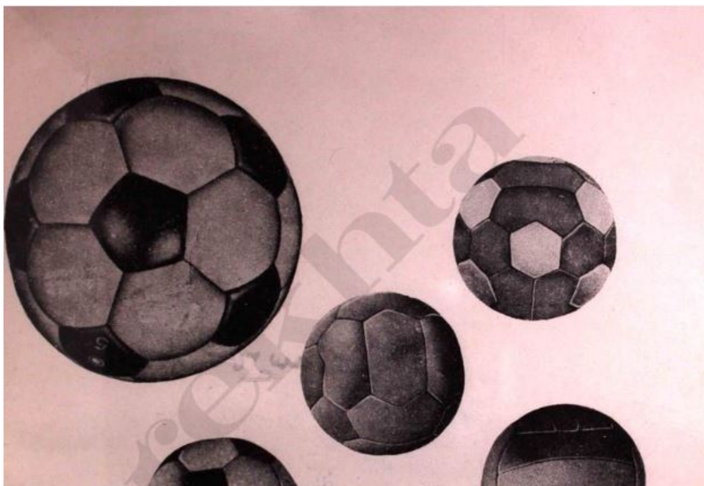
کسی بھی زبان کی ترقّی کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس میں مختلف سائنسی، علمی اور ادبی کتابیں لکھی جائیں اور دوسری زبانوں کی اہم کتابوں کے ترجمے شائع کیے جائیں۔ یہ نہ صرف زبان کی ترقّی کے لیے بلکہ قوموں کی معاشی اور سماجی ترقّی کے لیے بھی ضروری ہے۔ اُردو میں اسکولوں اور کالجوں کی نصابی کتابیں، بچّوں کے ادب، لغات اور سائنسی کتابوں کی ہمیشہ کمی محسوس کی جاتی رہی ہے۔ حکومتِ ہند نے کتابوں کی اس کمی کو دور کرنے اور اُردو کو فروغ دینے کے لیے ترقّیِ اُردو بورڈ قائم کر کے اعلا پیمانے پر معیاری کتابوں کی اشاعت کا ایک جامع پروگرام مرتّب کیا ہے، جس کے تحت مختلف سائنسی و سماجی علوم کی کتابوں کے ترجمے اور اشاعت کے ساتھ لغات، انسائیکلوپیڈیا، اصطلاحات سازی، اور بنیادی متن کی تحقیق و تیاری کا کام ہو رہا ہے۔

ترقّیِ اُردو بورڈ اب تک بہت سی نصابی کتابیں، بچّوں کے ادب، علمی، ادبی اور سائنسی کتابیں شائع کر چکا ہے جنھیں اُردو دُنیا میں بیحد مقبولیت حاصل ہوئی ہے، یہاں تک کہ بعض کتابوں کے دوسرے اور تیسرے ایڈیشن بھی شائع ہو رہے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب بھی اسی اشاعتی پروگرام کا ایک حصّہ ہے۔ مجھے امید ہے کہ اسے بھی علمی اور ادبی حلقوں میں پسند کیا جائے گا۔

(ڈاکٹر ایس۔ ایم۔ عبّاس شارب)

پرنسپل پبلیکیشن افیسر

بیورو فار پروموشن آف اُردو۔ وزارتِ تعلیم اور سماجی بہبود، حکومتِ ہند



فہرست

میری رام کہانی

بچو! مجھ سے ملو۔ میں فٹ بال ہوں۔

ارے! تم اُداس کیوں ہو گئے؟ کیوں کھوے گئے؟ کس الجھن میں ہو۔ شاید سوچ رہے ہو: لوگ مجھے ٹھوکریں مارتے ہیں۔ اور اس سے مجھے بے حد تکلیف ہوتی ہوگی۔ ہاں۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔ تکلیف تو ضرور ہوتی ہے۔ لیکن تم نے شاید یہ کبھی نہیں سوچا ــــ مجھے ٹھوکریں مارنے والے مجھے کتنا چاہتے ہیں۔ جس کے پاؤں میں آجاتا ہوں، اس کی یہی خواہش ہوتی ہے: مجھے کوئی دوسرا چھینے جھپٹے نہیں۔ بس ایک اِسی خیال سے میری تکلیف کم ہو جاتی ہے۔ میں سوچتا ہوں: پھر وہ بھی کیا زندگی ہے جو صرف اپنے لیے ہو۔ دوسروں کو خوش دیکھ کر، دوسروں کی خوشی کا سبب بن کر مجھے بے حد خوشی ہوتی ہے۔ میں اپنی تکلیف بھول سا جاتا ہوں ــــ ایک بات اور بھی ہے ــــ مجھ میں ہوا بھری ہے۔ اس سے میں ہلکا ہوا ہوں۔ پیر زمین پر نہیں ٹکتے۔ اونچا اور اونچا اٹھنا چاہتا ہوں۔ اُڑا اُڑا پھرتا ہوں۔ میرے لیے ٹھوکریں یوں بھی ضروری ہیں۔ ٹھوکروں سے ہوا تو نہیں نکلتی۔ سر سے غرور کی ہوا البتہ چلی جاتی ہے۔



اوہ ــــ تو تم مسکرا رہے ہو۔ بڑے شریر ہو۔ میں خوب سمجھتا ہوں۔ بتاؤں تم کیوں مسکرائے تھے؟ بس یہی سوچ کر نا کہ میں کیسا گول مٹول ہوں۔

لیکن میں شروع شروع میں ایسا نہیں تھا۔ میں کیسا تھا؟ کہاں تھا؟ میرا بچپن کا نام کیا تھا؟ یہ تو مجھے خود بھی ٹھیک ٹھیک یاد نہیں۔ ہاں۔ لوگ کہتے ہیں: میرا گھر روم ہے۔ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ رومی مجھے اپنے ساتھ برطانیہ لے گئے تھے۔ وہاں رومیوں نے کئی شہر بنائے بسائے تھے۔ ان شہروں میں ایسے ثبوت ملے ہیں: جن سے پتہ چلتا ہے کہ رومی حضرت مسیح کی پیدائش سے پہلے کے زمانے میں ایک کھیل ہارپس ٹم کھیلا کرتے تھے۔ وہ ہارپس ٹم مجھی سے کھیلا کرتے تھے۔ لیکن شاید اس وقت میں ایسا نہ تھا۔ میرا نام بھی کچھ اور تھا۔ کھیل کا میدان بھی ایسا نہ ہوتا تھا۔ کوئی گول وغیرہ نہ تھا۔ میدان کے دونوں سروں پر ایک ایک لکیر کھینچ دی جاتی تھی۔ کھیل یوں شروع ہوتا تھا: میدان کے بیچ مجھے اچھال دیا جاتا۔ بس پھر ایک دھکم پیل شروع ہو جاتی۔ کھیلنے والوں کے دو گروہ مجھے اپنی مخالف سمت میں کھینچی لکیر کے دوسری طرف پھینکنے کی کوشش کرتے تھے۔

ہاں رومیوں کے بنائے شہر چیسٹر میں شرووٹنگل کے دن یہ کھیل خاص طور پر کھیلا جاتا تھا۔ پتہ ہے: شرووٹنگل کیا ہے؟ یہ ایک تہوار ہے جو رومی روزے سے پہلے مناتے تھے۔ اُس دن کھیل کے مقابلے دوسرے قصبوں میں بھی ہوتے تھے۔ سب سے دلچسپ مقابلہ بیاہی عورتوں اور کنواری لڑکیوں کے درمیان ہوتا تھا۔ عجیب بات ہے: یہ مقابلہ ہمیشہ بیاہی عورتوں نے جیتا۔

ابھی میں نے رومیوں کے بسائے شہر چیسٹر کا ذکر کیا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ چیسٹر ہی کو میرا گھر سمجھنا چاہیے۔ اس لیے کہ چیسٹر کے چمڑا بنانے والوں نے مجھے میری موجودہ شکل سے ملتی جلتی شکل دی تھی۔ انہوں نے چمڑے کا ایک بڑا گیند بنایا اور فٹ بال جیسے یعنی میرے کھیل کے شوقینوں کو چالیس پینس میں بیچا تھا۔

بعض کہتے ہیں ــــ میں نفرت کے نتیجے میں بنا ہوں۔ وہ کہتے ہیں: میرے کھیل کی ابتدا ایک انگریز نوجوان نے کی۔ تم جاننا چاہو گے: اس میں نفرت کی کیا بات ہے؟ ہوا یوں کہ اس انگریز نوجوان نے ڈنمارک کو لوٹ گئے حملہ آوروں کے خلاف اپنی نفرت اور غصہ اس طرح ظاہر کیا تھا ــــ ایک ڈین کی

کھوپڑی کولات ماری تھی۔ بعد میں یہی چمڑا چڑھے اور ہوا بھرے بلیڈر کو ٹھوکریں مارنے کے کھیل ــــ یعنی فٹ بال میں بدل گیا۔ اس طرح میرا جنم ہوا۔

وقت گزرتا گیا اور اس کے ساتھ ساتھ مجھے پسند کرنے اور مجھ سے کھیلنے والوں کی تعداد بھی بڑھتی گئی۔ اب انہیں میری ضرورت صرف دن تہواروں پر نہیں ہوتی تھی۔ گاؤں کے میدان تھے۔ میں تھا اور مجھ سے کھیلنے والے۔ ان کا شوق بے مثال تھا۔ کبھی کبھی تو وہ مجھ سے گلیوں اور بازاروں میں بھی کھیلنے لگتے تھے۔ لیکن ایسا نہیں کہ میرے دشمن نہیں تھے۔ میں نے اپنی زندگی میں بڑی اونچ نیچ دیکھی ہے۔ لوگ مجھے بے حد چاہنے لگے تھے۔ مجھ سے کھیلنے اور چھیننے جھپٹنے میں لڑائی جھگڑے کی صورت پیدا ہو جاتی تھی۔ ہڈی ٹوٹنا، سر پھٹنا، کپڑے پھٹ جانا، ہیٹ کھو جانا وغیرہ جیسی باتیں میرے کھیل میں معمولی سمجھی جاتی تھیں۔ اُن دنوں اس میں ہنرمندی کی کم اور طاقت کی ضرورت زیادہ پڑتی تھی: جبھی تو ایک فرانسیسی نے انگریزوں کو فٹ بال کھیلتے ہوئے دیکھ کر کہا تھا ــ حیرانی ہے: انگریز اسے کھیل کہتے ہیں۔ اگر یہ کھیل ہے تو پھر جھگڑا کسے کہتے ہیں ؟ لیکن سولہویں صدی کے ایک انگریز مصنف نے میرے کھیل کو "خونی کھیل" کہہ کر تو کمال ہی کر دیا۔ خیر اپنا اپنا خیال ہے لیکن ایک بات بہت صاف ہے۔ میرے کھلاڑیوں میں بڑا جوش ہوتا ہے۔ یہی نہیں، میرے کھیل اور کھلاڑیوں کو دیکھنے والے بھی جوش سے بھرے ہوتے ہیں۔ جانتے ہو جنوبی امریکہ میں آج بھی فٹ بال میدان کے چاروں طرف اونچے اونچے کانٹے دار تار لگا دیے جاتے ہیں تاکہ کھیل دیکھنے والے خوشی یا غصے میں میدان میں نہ گھس آئیں۔ کھیل کو نہ بگاڑیں۔ کھلاڑیوں کو پریشان نہ کریں۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا ــ میں نے زندگی میں بڑی اونچ نیچ دیکھی ہے۔ انگلستان میں اور اسکاٹ لینڈ میں میرے کھیل پر پابندیاں لگائی گئیں۔ کہا گیا کہ لوگ مجھ سے نہ کھیلیں۔ ایسا قانوناً ہوا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب سپاہیوں کے ہتھیار توپ بندوق نہیں، تیر کمان ہوتے تھے۔ سرکار کا خیال



تھا: میری وجہ سے سپاہی تیر چلانے کی مشق پر کم دھیان دینے لگے ہیں اور یہ کہ اس طرح فوجی نکمّے ہو جائیں گے۔

سوچو تو مجھ پر کیا گزری ہوگی ــــ جب ۱۳۶۵ء میں بادشاہ ایڈورڈ سوم نے "فوجی ضرورت" کا نام لے کر مجھ پر پابندی لگا دی تھی۔ بات صرف ایڈورڈ سوم کی نہیں۔ ایسے حکم رچرڈ دوم، ہنری چہارم، ہنری ہشتم اور ملکہ ایلزبتھ نے بھی جاری کیے تھے۔ اسکاٹ لینڈ میں بھی صورت کچھ اچھی نہ تھی۔ وہاں بھی مجھے بے حد تکلیف پہنچی: جیمز گھرانے کے بادشاہ مجھے بے حد ناپسند کرتے تھے۔ اس لیے مجھ پر بار بار قانونی پابندیاں لگاتے تھے۔ پَر ایک بات کی مجھے بڑی خوشی ہے۔ میں بادشاہوں کی نگاہوں میں کھٹکتا تھا، لیکن لوگ مجھے بے حد چاہتے اور پسند کرتے تھے۔ وقت گزرتا گیا۔ وقت گزرنے پر جیسے ہی لوگ بادشاہوں کے حکم کو بھولے۔ یا پھر جب ایسے حکم کی مدّت ختم ہوئی، وہ مجھے میدانوں میں لیے لیے دوڑے لیکن وہ میدان آج کے کھیل کے میدان جیسے نہیں ہوتے تھے۔ تمہیں ۱۶۰۲ء کی بات بتاؤں۔ اُس سال کی چھپی ہوئی ایک اطلاع کے مطابق دو گولوں کا درمیانی فاصلہ تین یا چار میل ہوتا تھا اور پھر ایسا بھی ہوتا تھا کہ میدان کے دو سرے دو گاؤں مان لیے جاتے تھے اور کھیلنے والوں کی تعداد! ـــ وہ بھی گیارہ نہ ہوتی تھی بلکہ کچھ طے نہ ہوتی تھی۔ کھیلنے کے وقت موجود اور کھیل کے لیے راضی لوگوں کو سامنے رکھتے ہوئے کھلاڑیوں کی تعداد طے کر لی جاتی تھی۔

ایک بات اور: پُرانے زمانے میں مجھ سے کھیلنے والے بڑا ہنگامہ، بڑا غل غپاڑہ کرتے تھے۔ مجھ سے اور مخالف ٹیم کے کھلاڑیوں سے بڑا کھُردرا پیش آتے تھے لیکن آج وہ من مانی نہیں کر پاتے۔ ایک آدمی اُن کے کھیل کی نگرانی جو کرتا ہے! جانتے ہو، اُسے ریفری کہتے ہیں۔ ریفری اپنے کام میں دو اور آدمیوں سے مدد لیتا ہے۔ یہ دونوں میدان



کی لمبائی کے رُخ سے کھینچی حد یعنی سائڈ لائن کے ساتھ ساتھ رہتے، دوڑتے، کھلاڑیوں کو دیکھتے اور ریفری کو مدد اور مشورہ دیتے ہیں۔ یہ "لائن مین" کہلاتے ہیں۔ آج تو کھیل کے طور طریقے ہی اور ہیں۔ تمہیں ایک دلچسپ بات بتاؤں۔ آج میرے کھیل کو کھُردرا اور صرف مردوں کا کھیل نہیں سمجھا جاتا۔ اب انگلستان، جرمنی اور دوسرے کئی سارے ملکوں میں عورتیں بھی فٹ بال کھیلتی ہیں۔ ان ملکوں میں میرے کئی سارے کلب ایسے ہیں جو صرف عورتوں کے ہیں۔ بس یوں سمجھ لو کہ میرے لیے بھی تاریخ نے خود کو دُہرایا ہے۔ عورتیں ایک بار پھر فٹ بال کھیلنے لگی ہیں۔ اور اب تو عورتوں کی ٹیموں کے لیے ورلڈ کپ ٹورنامنٹ بھی ہونے لگا ہے۔

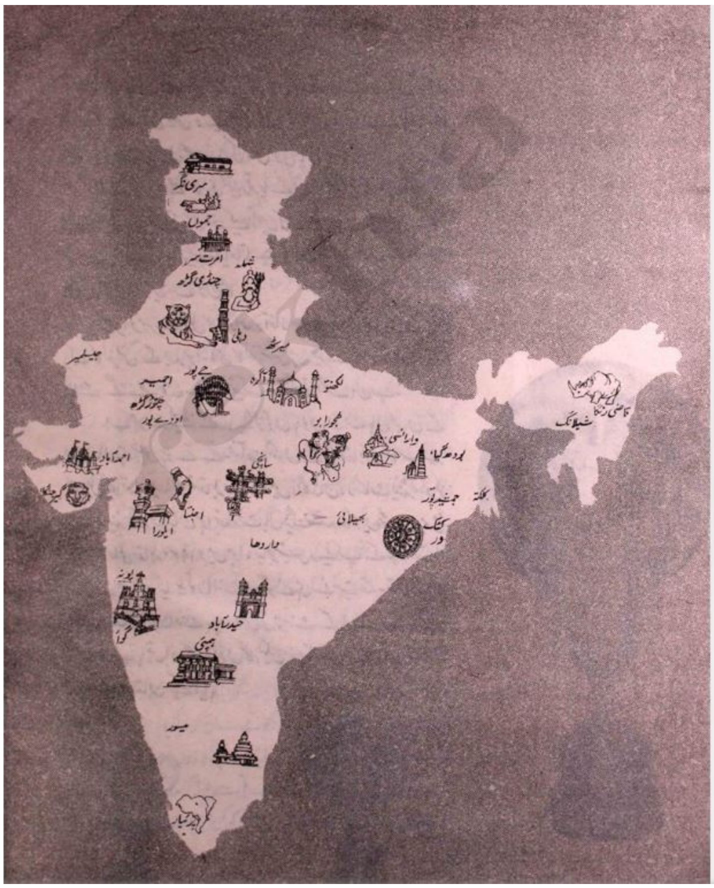
ہاں، تو میں تمہیں اپنی مقبولیت کے بارے میں بتا رہا تھا۔ تمہیں پتہ ہے نا: انیسویں صدی میں انگلستان میں ایک صنعتی انقلاب آیا تھا۔ نتیجے میں بڑی تبدیلیاں ہوئی تھیں۔ شہروں میں جگہ جگہ کارخانے کُھل گئے تھے۔ یہ دیہات کے لوگوں کے لئے بڑی کشش رکھتے تھے۔ اس لیے کہ انہیں کام دھندہ چاہیے تھا۔ اس طرح لاکھوں لوگ دیہات کو چھوڑ کر شہروں میں آ بسے تھے۔ یہاں اُن کے لئے ایک نئے ڈھنگ کی زندگی شروع ہوئی تھی یہاں اُن کے لیے شکار اور گھڑ سواری جیسے کھیلوں کی گنجائش نہیں تھی۔ لیکن زیادہ سنجیدہ لوگ مجھے اب بھی ناپسند کرتے تھے۔ امیر گھرانے کے لڑکے میرے قریب نہ آتے تھے۔ بس اُنہیں گھڑ سواری اور شکار ہی بھاتے تھے۔

پھر میرے دن پھرے۔ پبلک اسکول قائم ہوئے۔ میری مقبولیت اور بڑھی۔ ان اسکولوں میں ہر لڑکے نے اپنے آپ کو دوسرے بے شمار لڑکوں کے درمیان پایا۔ وہ وہاں عجب اُلجھن میں تھے۔ پڑھنے لکھنے کے بعد کیا کریں؟ وہ اس سوچ میں تھے۔ آخر، میں ہی اُن کے کام آیا اور اسکولوں میں میرا غُل غپاڑے والا کھیل یعنی فٹ بال شروع ہوگیا۔

ہر اسکول میں کھیل کے قاعدے الگ تھے۔ اب میدان بھی پہلے جتنے لمبے چوڑے نہ رہے تھے۔ لڑکے بالے مجھے پیروں سے دھکیلتے، ہوا میں اُچھالتے اور مخالف ٹیم کے گول کی طرف بڑھاتے۔ میری مرضی اور خوشی تو اُن کی مرضی اور خوشی میں تھی۔ اس لئے وہ مجھ سے بے حد خوش رہتے تھے — اور جب وہ اسکولوں سے نکل کر کالجوں میں گئے، تو مجھے بھی ساتھ لے گئے۔ ہُوا یُوں کہ پبلک اسکولوں کے دو کھلاڑیوں نے ایک فٹ بال کلب بنایا۔ یہ ۱۸۴۶ء کی بات ہے — وہ کلب تو نہ چل پایا لیکن نتیجے میں لوگ میری طرف زیادہ دھیان دینے لگے۔ اتنا کہ مجھ سے کھیلنے والوں کے لیے قاعدے، ضابطے بنانے کی ضرورت محسوس کی گئی۔

میرے دو بڑے قدردان گزرے ہیں — ایچ سی ملڈین اور جارج سولٹ۔ انہوں نے ۱۸۴۵ء اور ۱۸۵۰ء کے درمیان پبلک اسکولوں کے پُرانے طالب علموں کی ایک کانفرنس بُلائی اور فٹ بال کھیلنے کے طریقے، قاعدے مقرر کر دیے۔ یہ طریقے قاعدے مختلف اسکولوں میں اپنائے جانے والے بہترین طریقوں اور قاعدوں کا مجموعہ تھے۔ اس کانفرنس کا نتیجہ میرے حق میں اچھا نکلا۔ گو ایک بات کا مجھے دُکھ بھی ہوا: یہ کہ مجھ سے کھیلنے والوں کو مجھے ہاتھ لگانے سے منع کر دیا گیا۔ یہ طے پا گیا کہ میری چمڑے سے بنی کھال کے نیچے ربڑ کا بلیڈر رہے گا اور یہ ہوا سے بھرا ہوگا۔

گول دو کھمبوں کو اوپر سے ایک بلّی سے جوڑ کر بنایا گیا۔ کھمبوں کے بیچ مجھے پھینکنے سے گول ہو جاتا تھا۔ اسی کو کھیل کا مقصد بنا لیا گیا اور اسی



کو کمال سمجھا جانے لگا۔ ایسا کمال کہ آج گول کر سکنے والے کھلاڑیوں کو بڑے بڑے کلب منہ مانگی فیس دیتے ہیں۔ فیس ؟ ہاں ! دوسرے پیشوں اور کھیلوں کی طرح میرا کھیل بھی، آج کی اس ترقی پائی ہوئی دنیا میں، ایک پیشہ بن گیا ہے۔ کون اچھے کھلاڑی کتنی رقم پاتے ہیں ؟ کھیل کے علاوہ وہ اپنی مقبولیت کی وجہ سے کتنی بڑی اور کیسے رقمیں کماتے ہیں ؟ ان کی مقبولیت کو تجارت کی ترقی کا ذریعہ کیسے بنایا جاتا ہے ؟ اِن سَب باتوں کے بارے میں مَیں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔

خیر، تو میرے کھیل کا باقاعدہ آغاز ۱۸۶۳ء میں کیمبرج میں ہوئی ایک کانفرنس کے بعد ہوا۔ اسی کانفرنس میں میرے کھیل کے قاعدے بنائے گئے تھے۔ اس لیے میرا ٹھیک سے گھر تو انگلستان ہے۔

اب مجھ سے کھیلنے کے مقابلے لڑکوں بالوں اور فٹ بال کلبوں کے درمیان ہی نہیں ہوتے تھے۔ مختلف ملکوں کے بیچ مقابلوں کا سِلسلہ بھی چل نکلا تھا۔ ایسا پہلا مقابلہ ۱۸۸۲ء میں انگلستان، اسکاٹ لینڈ، ویلز اور آئرلینڈ کے درمیان ہوا تھا۔ فٹ بال لیگ ۱۸۸۸ء میں شروع ہوئی۔ لیکن پہلا عالمی مقابلہ ۱۹۳۰ء میں ہوا۔ یہ جولیس ریمے کپ کے لیے تھا۔ اروگوئے میں کھیلا گیا یہ ٹورنامنٹ اروگوئے ہی نے جیتا تھا۔ یہ آج دُنیا کا سَب سے بڑا ٹورنامنٹ ہے۔ اس ٹورنامنٹ کے بارے میں میں تمہیں بعض دلچسپ باتیں اور بھی بتاؤں گا، لیکن سوچتا ہوں : پہلے تو یہ بتادوں کہ میں ہندوستان کیسے آیا؟





میں ہندوستان آیا



اُنیسویں صدی میں انگلستان میں آئے صنعتی انقلاب کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں۔ یہ بتا چکا ہوں کہ اس کے نتیجے میں کارخانے کھُلے دیہاتی اپنے گھر بار چھوڑ کر شہروں میں آبسے۔ لیکن یہ بات اپنی جگہ ادھوری ہے۔ دیہاتی شہروں میں آئے۔ شہری شہر سے بلکہ ملک سے باہر گئے۔ اُن کے لیے اور کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ شہری سے میری مُراد کارخانہ دار اور تجارت پیشہ لوگوں سے ہے۔ کارخانہ داروں کو مال کی تیاری کے لیے کچّا مال چاہیے تھا اور تیار مال کے لیے منڈیوں کی ضرورت تھی۔ اس دوہری ضرورت سے انگریزوں نے دوسرے ملکوں کا رُخ کیا — ہندوستان اُن دنوں سونے کی چڑیا سمجھا جاتا تھا۔ اُن کی نظریں ہندوستان پر بھی لگی ہوئی تھیں۔

انگریزوں کی ایک کاروباری کمپنی — ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان آئی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا نام تم نے ضرور سُنا ہوگا۔ بعد میں اسی تجارتی کمپنی نے ہندوستان کو غلام بنایا تھا۔ وہی یہاں انگریزی حکومت کا باعث بنی تھی۔ خیر! یہاں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ذکر سے میرا مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ انگریز ہندوستان آئے۔ وہ مجھے اپنے ساتھ یہاں لائے تھے۔ بات ایک ہندوستان کی نہیں۔ انگریز تاجر جہاں جہاں اور جس جس ملک میں گئے، مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ انگلستان سے باہر دوسرے ملکوں میں میری مقبولیت کا ایک سبب انگلستان کی بحری فوج کے سپاہی بھی تھے۔ وہ ہمیشہ مجھے اپنے ساتھ رکھتے تے اور موقع ملنے پر مجھے مقامی لوگوں سے ملاتے تھے۔ اُن سے میرے دوستانہ میچ کھیلتے تھے۔

اچھا بتاؤ تو میں پہلے پہل ہندوستان کے کن شہروں میں پہنچا ہوں گا؟ کسی بندرگاہ پر؟ — ہاں! ٹھیک کہا تم نے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے کلکتہ کو اپنا خاص مرکز بنایا تھا۔

ہندوستان میں کلکتہ کو میرا گھر کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔ کلکتہ کے ذکر کے بغیر میری کہانی اَدھوری لگے گی۔ کلکتہ ہی وہ شہر ہے، جہاں انگریزوں نے پہلے پہل فٹ بال کلب بنائے، دوستانہ میچ کھیلے۔

کلکتہ میں سب سے پہلا مقابلہ ٹریڈز کپ ٹورنامنٹ تھا۔ یہ ہندوستان کے سب سے پُرانے یعنی ڈلہوزی فٹ بال کلب نے شروع کیا تھا۔ یہ پہلی بار ۱۸۸۹ء میں کھیلا گیا تھا۔ ڈلہوزی فٹ بال کلب کا ذکر آیا ہے تو ایک بات اور بتا دوں۔ اُس کا پہلا نام ٹریڈز کلب تھا۔ یہ ۱۸۷۸ء میں بنا تھا۔

بات فٹ بال کلبوں اور فٹ بال کے مقابلوں کی ہو رہی تھی۔ ہاں، اُس ڈلہوزی کلب کے علاوہ میرے کتنے سارے اور کلب بھی تھے۔ ایک دوسرا اہم کلب کلکتہ فٹ بال کلب تھا۔ پہلے پہل قائم ہوئے کلبوں میں نیول والنٹیئرز کلب، ہوڑہ کلب، اور امریکن کلب خاص طور پر ذکر کے قابل ہیں۔ یہی نیول والنٹیئرز کلب بعد میں کلکتہ رینجرز کلب کے نام سے بڑا مشہور ہوا۔

ہندوستان میں، میرے لیے اُنیسویں صدی کے آخری پچیس برس خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ اس عرصے میں نہ صرف کلب بڑی تعداد میں بنے بلکہ کلکتہ کے کالجوں کے دروازے بھی میرے لیے کھُلے۔ ریذیڈنسی کالج فٹ بال کلب ۱۸۸۴ء میں قائم ہوا۔ پھر شب پور انجینیرنگ کالج، بشپس کالج، میڈیکل کالج،



سینٹ زیویئر کالج اور لامائی ٹنیئر نے بھی فٹ بال کلب بنالیے ۔ ایک بات : آج ہندوستان میں جن فٹ بال کلبوں کا بول بالا ہے، اُن میں سے بعض اِسی عرصے میں قائم ہوئے تھے۔ مثلاً موہن بگان ۱۸۸۹ء میں، محمڈن اسپورٹنگ ۱۸۹۱ء میں وغیرہ وغیرہ ۔ اُس زمانے کا ایک دوسرا اہم کلب سوابازار کلب تھا۔ یہی وہ پہلی ٹیم تھی، جس نے ۱۸۹۲ء میں فائنل میں ایک فوجی ٹیم کو ہرایا اور ٹریڈز کپ جیتا تھا۔ یہ ہندوستان میں میرے کھیل کی ترقی کی ایک ایسی مثال تھی، جس کی خبریں لندن تک کے اخباروں میں چھپیں ۔ ۱۸۹۲ء تک ٹریڈز کپ کی بڑی اہمیت تھی۔ اُسی برس انڈین فٹ بال ایسوسی ایشن بنی تھی۔ اس ایسوسی ایشن نے ایک شیلڈ ٹورنامنٹ شروع کیا۔ اس سے ٹریڈز کپ ٹورنامنٹ کی حیثیت میں بڑا فرق آیا۔ لیکن بیسویں صدی کے پہلے دَہے تک بڑے سارے ہندوستانی اُسے عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ وجہ —— یہ کہ شیلڈ کا مقابلہ صرف یورپی ٹیموں کے لیے تھا اور حد تو یہ ہے کہ موہن بگان شیلڈ کے ٹورنامنٹ میں پہلی بار ۱۹۱۰ء میں شریک ہو پائی تھی۔ اور وہ بھی اُس وقت، جب اُس نے لگاتار تیسری بار ٹریڈز کپ جیتا۔ اُن دنوں فوجی ٹیموں کا کھیل بہت اچھا ہوا کرتا تھا لیکن کلکتہ فٹ بال کلب، ڈلہوزی اتھیلیٹک کلب اور کلکتہ رینجرز ایسی غیر فوجی ٹیمیں تھیں جو اچھی سے اچھی فوجی ٹیموں کا مقابلہ کر سکتی تھیں ۔ اُن دنوں بنگال کی ٹیموں کی ایک خاص بات یہ تھی کہ اُن کے سارے کھلاڑی بنگالی ہوا کرتے تھے اور ننگے پیر کھیلا کرتے تھے۔

ہاں، تو اب ہندوستان میں لوگ مجھ سے نہ صرف کھیلنے لگے تھے بلکہ میرے کھیل اور کھلاڑیوں کو دیکھنے کے لئے بھاری تعداد میں آنے لگے تھے۔ اب ہندوستان میں میرا چلن عام ہو چلا تھا اور اب کی بات بالکل دوسری ہے۔ اِن دنوں پٹیالہ میں کھیلوں کا قومی اِدارہ، میرے کھیل کے معیار کو اونچا بنانے کے لیے برابر اور باقاعدہ کوشش کر رہا ہے۔

میں اور میرا کھیل

ہاں — تم ٹھیک کہتے ہو. میں سچ مچ اُلجھن میں ہوں۔ سوچتا ہوں : پہلے ہندوستانی ٹیموں اور ٹورنامنٹوں کے بارے میں بتاؤں یا یہ بتاؤں کہ میں کیسا ہوں اور کیسے کھیلا جاتا ہوں. میرا خیال ہے : دوسری بات پہلے بتانا ٹھیک ہوگی. کیوں ٹھیک ہے نا !

ہاں، تو ایک بات کی طرف میں پہلے بھی اشارہ کر چکا ہوں۔ وہ یہ — کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دوسرے تمام کھیلوں کی طرح میرے کھیل میں بھی تبدیلیاں آئی ہیں. کھیل کے قاعدے بدلے ہیں طریقے بدلے ہیں. ایک لمبے عرصے تک رواج کچھ ایسا رہا — ایک ٹیم میں ایک گول کیپر ہوا کرتا تھا، جو مجھے گول میں جانے سے روکتا تھا۔ ایک فُل بیک ہوتا تھا، جو مخالف ٹیم کے کھلاڑیوں کو اور مجھے اپنے گول کی طرف جانے نہیں دیتا تھا. ایک ہاف بیک ہوتا تھا جو فُل بیک کو اور دوسرے کھلاڑیوں کو مجھے مخالف ٹیم کے گول میں پہنچانے میں مدد دیتا تھا. باقی آٹھ کھلاڑی سارے میدان میں میرے لیے بھاگے دوڑے پھرتے تھے. اُن کی

گلی کوچوں میں کھیل کا ایک منظر

شان شکاری کتوں جیسی تھی. جدھر میں گیا، اُدھر سارے کے سارے لپکے۔ وہ آج جیسی فارورڈ لائن کے کھلاڑی کم لگتے تھے. وہ سب کے سب مجھے اپنے پیروں میں گھماتے ہوئے آگے بڑھتے تھے. وہ گول کیپر کو اُس کی جگہ سے ہٹانے کی کوشش کرتے تھے تاکہ مجھے گول کے اندر پھینکا جا سکے اور گول ہو جائے. اُس کے بعد ٹیم میں ایک گول کیپر، دو فُل بیک، دو ہاف بیک اور چھ فارورڈ کھلاڑی ہونے لگے.

کھیل کا موجودہ طریقہ ۱۸۸۳ء میں اپنایا گیا یعنی اب دو کی بجائے تین ہاف بیک اور چھ کی بجائے پانچ فارورڈ کھلاڑی ہوتے ہیں اور اب کھیل کا یہی طریقہ دُنیا بھر میں اپنایا جاتا ہے. ہاں کچھ ٹیمیں ایسی ہیں جو تین فُل بیک کھلاڑیوں کے ساتھ کھیلتی ہیں. گویا کھیل کا اندازہ اب بدل گیا ہے. یہ زیادہ اصولی اور باقاعدہ بنا ہے.

ایک بات — میں نے کہا تھا — میں شروع شروع میں کیسا تھا. — یہ تو مجھے یاد نہیں. ہاں اِدھر جو تبدیلی مجھ میں آئی ہے، وہ میں ضرور بتا سکتا ہوں. پہلے میرے ربڑ کے بنے بلیڈر میں ہوا بھرنے کو ایک نلی ہوتی تھی.

ہوا بھرنے کے بعد اُس تین انچ لمبی نلی کو مضبوطی سے باندھ دیا جاتا تھا. اُسے دوہرا کر کے میرے منہ میں ٹھونسا اور پھر تسمے سے میرا منہ باندھ دیا جاتا تھا. بالکل ایسے ہی جیسے تم اپنے جوتے کے تسمے باندھتے ہو. مقصد تھا بلیڈر میں بھری ہوئی ہوا نکلنے نہیں پائے اور میں ہلکا ہو کر خوب اُچھل سکوں. آسانی سے ہوا میں اُچھالا اور دُور بہت دُور پھینکا جا سکوں.

اب میں نے جامہ بدل لیا ہے. اب میرا منہ تسمے سے بند کرنے کی ضرورت نہیں رہی. پمپ کی نلکی ایک سوراخ میں ڈال کر ہوا بھری جاتی ہے. ایسا انتظام کیا گیا ہے کہ ہوا بھر چکنے پر جیسے ہی نلکی باہر نکالتے ہیں، سوراخ اپنے آپ بند ہو جاتا ہے. اب میری رنگت بھی پہلے جیسی نہیں رہی. کبھی میں بھورے رنگ کا ہوا کرتا تھا. اب ہلکے رنگ مجھے بہت بھاتے ہیں اور ہاں جن ملکوں میں دُھوپ

کم نکلتی ہے، وہاں میری سفید پوشی سے کھلاڑیوں کو بڑی سہولت رہتی ہے پہلے لوگ صرف دن میں مجھ سے کھیلتے تھے۔ اب رات میں بھی کھیلنے لگے ہیں۔ تم پوچھوگے کہ اندھیرے میں وہ کیسے کھیلتے ہیں؟ روشنی ایک سورج ہی کی نہیں ہوتی۔ گھر پر بجلی کی روشنی تو تم ہر روز دیکھتے ہو۔ بس لوگ بجلی کے بڑے بڑے بلبوں کی بڑی ہی تیز روشنی میں مجھ سے کھیلتے ہیں۔ ایسے میں میرا لباس اور بھی خوبصورت ہوتا ہے۔ بالکل سفید اور اس پر جگہ جگہ کالے نشان ہوتے ہیں۔ میرے اس لباس کی وجہ سے کھلاڑی مصنوعی روشنی میں بھی مجھے خوب دیکھ اور کھیل پاتے ہیں۔

میرے گول مٹول ہونے پر تم مسکرائے تھے۔ بھلا بتاؤ تو ــ میں کتنا گول ہوں؟ بس ۲۷-۲۸ انچ۔ میرا وزن؟ ہاں، میرا وزن بھی کچھ زیادہ نہیں۔ کھیل شروع ہونے پر ۱۴ سے ۱۶ اونس کے بیچ ہوتا ہے۔

جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں: کھلاڑیوں کو مجھے ہاتھ لگانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ وہ مجھے سر سے، پیر سے اور جسم کے کسی بھی حصے سے کھیل، اچھال اور آگے پھینک سکتے ہیں۔ صرف گول کیپر مجھے ہاتھ سے روک، اچھال اور کھیل سکتا ہے۔ لیکن وہ صرف پنلٹی ایریا میں ایسا کر سکتا ہے۔ پنلٹی ایریا کے باہر اسے بھی دوسرے کھلاڑیوں کی طرح پیر ہی سے کھیلنا ہوتا ہے اور اگر کہیں وہ مجھے ہاتھ لگا دے تو ہینڈ بال ہو جاتا ہے۔ گول کیپر پر ایک پابندی اور ہوتی ہے۔ وہ مجھے ہاتھ میں لے کر چار سے زیادہ قدم نہیں اٹھا سکتا۔ اسی لیے وہ مجھے زمین پر مارتا، پھر دبوچتا اور پھر ہاتھ سے یا پاؤں کی ٹھوکر سے اپنی ٹیم کے کسی کھلاڑی کی طرف پھینکتا ہے۔

کھیل کل نوّے منٹ کا اور دو برابر وقفوں میں بٹا ہوتا ہے۔ درمیان میں دس منٹ کا وقفہ ہوتا ہے۔ جو ہاف ٹائم کہلاتا ہے۔ یہ وقفہ کھلاڑیوں کے سستانے اور تازہ دم ہونے کے لیے ہوتا ہے۔ ہاف ٹائم کے بعد ٹیمیں گول بدل کر ایک دوسرے کے سامنے کھڑی ہوتی اور کھیلتی ہیں۔ گول مخالف ٹیم کے گول میں مجھے پھینکنے سے ہوتا ہے۔ کھلاڑی پیر کی ٹھوکر سے یا پھر سر سے مجھے گول میں پھینکتے ہیں۔ لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ گول بچانے کی خاطر فل بیک یا کوئی دوسرا کھلاڑی اپنے ہی گول کیپر کی طرف مجھے پھینک دیتا ہے۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ میں موقع پا کر اس کے ہاتھ سے نکل بھاگتا ہوں۔ گول میں جا دھمکتا ہوں۔ ایسے گول کو خود اپنے خلاف کیا ہوا گول کہتے ہیں۔

فٹ بال کھیلنے کے قاعدوں اور طریقوں کی بعض خلاف ورزیاں یہ ہیں۔ ــ آف سائڈ، ہینڈ بال، دھکا دینا، گرا دینا یا مخالف ٹیم کے کھلاڑی پر حملہ کرنا۔ ان سب بے قاعدگیوں کا جرمانہ فری کِک ہوتی ہے۔ جس مقام پر بے قاعدگی ہوئی ہو، مجھے وہاں رکھ دیا جاتا ہے اور مخالف ٹیم کا کھلاڑی مجھے پاؤں کی ٹھوکر لگا کر اپنے کسی ساتھی یا پھر مخالف ٹیم کے گول کی طرف پھینکتا ہے۔ پنلٹی ایریا میں بے قاعدگی کرنے پر پنلٹی کِک کی سزا دی جاتی ہے۔ یہ سزا کچھ کڑی ہوتی ہے۔ اس لیے کہ اس کے نتیجے میں عام طور پر گول ہو جاتا ہے۔ پنلٹی ایریا میں کسی دوسرے کھلاڑی کو کھڑے ہونے کی اجازت نہیں ہوتی۔ بس گول کیپر ہوتا ہے اور پنلٹی کِک لگانے والا مخالف ٹیم کا کھلاڑی۔

میرا کھیل اس طرح شروع ہوتا ہے: دونوں ٹیموں کے کپتان میدان کے بیچوں بیچ آتے ہیں۔ ریفری سکہ اچھالتا ہے۔ ایک کپتان ٹیر مانگتا ہے۔ دوسرا خط۔ سکہ گرتا ہے۔ جیتنے والا کپتان اپنے لیے میدان کا سِرا چنتا ہے یا کِک۔ اس پر دونوں ٹیموں کے کھلاڑی اپنی اپنی جگہ پر آ کر کھڑے ہوتے ہیں۔ مجھے میدان کے بالکل بیچ میں رکھ دیا جاتا ہے۔ ٹاس ہارنے والی ٹیم کا سینٹر فارورڈ مجھے پاؤں سے اپنے قریب ہی کھڑے ساتھی کی طرف پھینکتا ہے اور کھیل شروع ہو جاتا ہے۔ گول ہونے پر کھیل پھر اسی طرح شروع کیا جاتا ہے۔ اگر کوئی کھلاڑی مجھے لمبائی کے رُخ کھنچی حد یعنی سائڈ لائن سے باہر پھینکتا ہے تو "تھرو اِن" ہو جاتا ہے۔ اس پر مخالف ٹیم کا کھلاڑی مجھے اپنے دونوں ہاتھوں سے دونوں ہاتھوں کو سر سے اوپر اٹھا کر اور اپنی جگہ سے ہلے بغیر، اپنے ساتھی کھلاڑی کے پاس

پھینک کر کھیل شروع کرتا ہے۔ پہلے "تھرو اِن" کا طریقہ یہ نہیں تھا۔ یہ پہلے ایک ہاتھ سے کیا جاتا تھا۔ جانتے ہو کھلاڑیوں نے مجھے دور، بہت دور پھینکنے کی کتنی مشق کر لی تھی؛ وہ مجھے چالیس سے پچاس گز کی دوری یعنی مخالف گول کے بالکل قریب تک پھینک سکتے تھے۔ اس میں انہیں بہت کم محنت کرنی پڑتی تھی جبکہ گول کرنے کا موقع بس یونہی ہاتھ آجاتا تھا۔ پھر یہ طریقہ بدل دیا گیا اور ویسا کر دیا گیا جیسا کہ میں نے ابھی تمہیں بتایا تھا۔

اگر گول کرنے کی کوشش میں مخالف ٹیم کے کھلاڑی کے پاؤں یا جسم کے کسی حصے سے لگ کر میں گول لائن کے باہر چلا جاؤں تو کھیل گول ایریا کے سرے پر مجھے رکھ کر اور کِک لگا کر شروع کرتے ہیں۔ یہ گول کِک کہلاتی ہے۔ اور اگر کوئی کھلاڑی مجھے اپنے پیچھے کی یعنی اپنی ہی گول والی حد سے باہر نکال دیتا ہے تو کارنر ہو جاتا ہے۔ اس پر مخالف ٹیم کا کھلاڑی کارنر کِک لگاتا ہے۔ یہ کِک خطرناک ہوتی ہے۔ اس میں گول ہونے کا بڑا ڈر رہتا ہے۔ مخالف ٹیم کا ایک کھلاڑی میدان کے گول کے قریب والے کونے پر مجھے رکھتا اور کِک لگاتا ہے۔ وہ مجھے پنلٹی ایریا میں پھینکتا ہے۔ مقصد ہوتا ہے: کوئی ساتھی کھلاڑی موقع پا کر مجھے گول کے اندر پھینک دے۔ کارنر کِک کو یوں بھی آدھا گول کہتے ہیں یہی وجہ ہے؛ کھلاڑی بڑی مجبوری کی حالت میں اور وہ بھی گول بچانے کے لیے مجھے گول لائن سے باہر پھینکتے ہیں۔



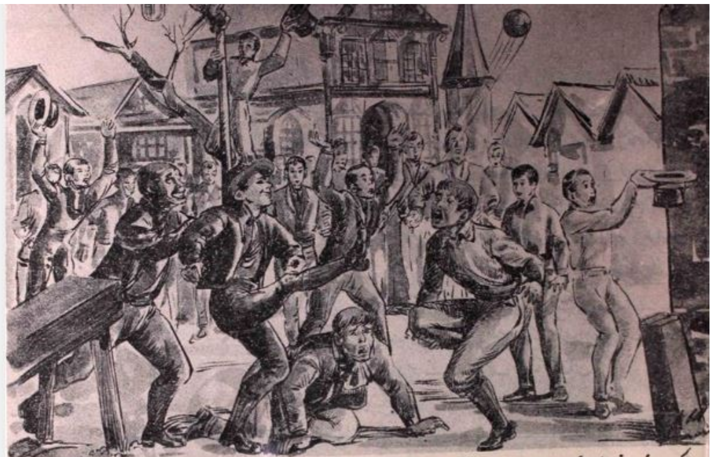
ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے تمہیں بتایا تھا ـــــ اب میرے کھیل کی نگرانی ایک ریفری کرتا ہے۔ وہ اس کام میں دو اور آدمیوں سے مدد اور مشورہ لیتا ہے۔ یہ "لائن مین" کہلاتے ہیں۔ لیکن ۱۸۹۱ء تک یہ "لائن مین" نہیں ہوا کرتے تھے۔ ہر ٹیم کا اپنا ایک امپائر ہوتا تھا۔ ایک ریفری ہوتا تھا۔ اور آخری فیصلہ ریفری کا مانا جاتا تھا۔ پھر امپائروں کا طریقہ ختم کر دیا گیا۔ صرف ریفری میچ کھلانے لگے۔ اس کا ایک اچھا نتیجہ نکلا ـــــ ۱۸۹۳ء میں ریفریوں کی ایک انجمن بنی۔ نتیجے میں کھیل کھلانے کا معیار اور اچھا ہو گیا۔ ۱۸۹۲ء میں ایک قاعدہ بنایا گیا۔ کہا گیا کہ اگر میں گول کیپر کے ہاتھ میں ہوں تو اس پر حملہ نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں اگر گول کیپر کھیل رہا ہو یا دوسرے

کھلاڑی کو گول کرنے سے روک رہا ہو تو بات دوسری ہے۔ پنلٹی کِک کا رواج انہی دنوں پڑا تھا۔

کھیل میں تبدیلی کے ساتھ ساتھ کھلاڑیوں میں بھی دھیرے دھیرے تبدیلی آئی۔ پہلے وہ گھٹنوں کے نیچے تک برجس پہنتے تھے۔ جو بہت مضبوطی سے باندھی ہوتی تھی۔ لمبے موزے اس کے اوپر چڑھے ہوتے تھے۔ جوتے عام جوتوں جیسے ہوتے تھے۔ اُن کے تلوں پر چمڑے کی تین پٹیاں پنجے کے نیچے والی طرف اور ایک پٹی ایڑی کے نیچے لگی ہوتی تھی۔ دیکھو ـــــ کتنی عجیب بات ہے: کھلاڑی اُن دنوں مونچھیں رکھتے تھے۔ ٹوپی پہنتے تھے۔ بعض تو داڑھی بھی رکھتے تھے لیکن آج کا کھیل بہت مختلف ہے۔ اب یہ زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ کھیلا جاتا ہے۔ اس میں ایک باقاعدگی آئی ہے۔ اب یہ طاقت کے بجائے ہنرمندی کا نمونہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کے کھلاڑیوں کا لباس، جوتے، موزے وغیرہ ماضی کے کھلاڑیوں جیسے نہیں۔

شاید تم یہ بھی جاننا چاہو گے کہ ایک ٹیم کے کھلاڑی ایک جیسی وردی کیوں پہنتے ہیں؟ اور وہ دوسری ٹیم کے کھلاڑیوں کی وردی سے مختلف کیوں ہوتی ہے؟ ہاں، اس کے کئی فائدے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہر کھلاڑی دور یا پاس سے اپنے ساتھی کھلاڑی کو اس کی وردی سے پہچانتا ہے اور مجھے اس کی طرف پھینکتا، بڑھاتا ہے۔ دوسرے ریفری کو یہ جاننے میں مدد ملتی ہے کہ بے قاعدگی کس ٹیم کے کھلاڑی نے کی ہے۔ تیسرے، دیکھنے والے آسانی سے جان پاتے ہیں کہ کس ٹیم کے کھلاڑی نے مجھے اپنے پیروں میں لیا ہے۔

اب وردی کا ذکر آیا ہے تو ایک بات اور بتا دوں۔ ہر کھلاڑی کی قمیص پر پیچھے ایک عدد ـــــ ۲، ۳، ۴ یا ۷ یا ۱۱ وغیرہ لکھا ہوتا ہے۔ اس کا مطلب بچوں کو گنتی سکھانا نہیں۔ یہ بتانا ہے کہ کھلاڑی کس پوزیشن میں کھیل رہا ہے۔ نمبر ۱ گول کیپر کا ہوتا ہے۔ پھر نمبر دائیں سے بائیں کو چلتے ہیں۔ رائٹ فُل بیک کا نمبر ۲ اور لیفٹ فُل بیک کا نمبر ۳ ہوتا ہے۔ ۶ سے ۱۱ نمبر فارورڈ کھلاڑیوں کے ہوتے ہیں۔ چھٹا آؤٹ سائڈ رائٹ اور نمبر ۱۱ آؤٹ سائڈ لیفٹ کا ہوتا ہے۔

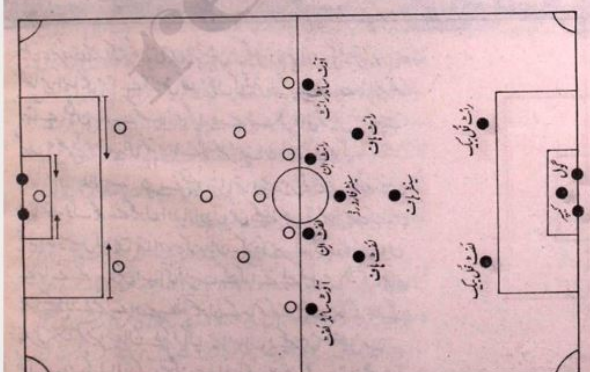


لیکن یہ ضروری نہیں کہ جو کھلاڑی جس پوزیشن میں کھیل رہا ہو، اس کی قمیض پر وہی عدد لکھا ہو۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض کھلاڑیوں کی قمیض پر گیارہ سے بڑا نمبر لکھا رہتا ہے۔ لیکن سارے کھلاڑی گیارہ سے بڑے نمبر والی قمیضیں نہیں پہنتے۔ کیوں؟ پھر نمبر کا مقصد ہی ختم ہو جائے گا۔ پھر پہچان بڑی مشکل ہو گی۔

اور میدان — میں نے تمہیں بتایا تھا، پہلے میرا کوئی میدان نہیں ہوتا تھا۔ لوگ مجھے گلیوں اور بازاروں میں کھیلتے پھرتے تھے۔ پھر یہ کہ میدان تین یا چار میل لمبا ہوتا تھا اور یہ کہ میدان کے دوسرے اکثر دو گاؤں مان لیے جاتے تھے — لیکن اب اتنی فرصت کسے کہ اتنے لمبے کھیل میں شریک ہو اور پھر دیکھنے والے میرے اور میرے ساتھیوں کے ساتھ کہاں تک بھاگے بھاگے پھریں۔ چنانچہ میرا میدان طے کر لیا گیا۔ میرا میدان دیکھنے میں مستطیل جیسا لگتا ہے۔ اس کی لمبائی ایک سو گز سے کم اور ایک سو تیس گز سے زیادہ نہیں ہوتی۔ چوڑائی پچاس سے ایک سو گز کے بیچ ہوتی ہے۔ عام رواج کے مطابق اِن دنوں میرے میدان کی لمبائی ایک سو پندرہ گز اور چوڑائی پینسٹھ گز ہوتی ہے۔

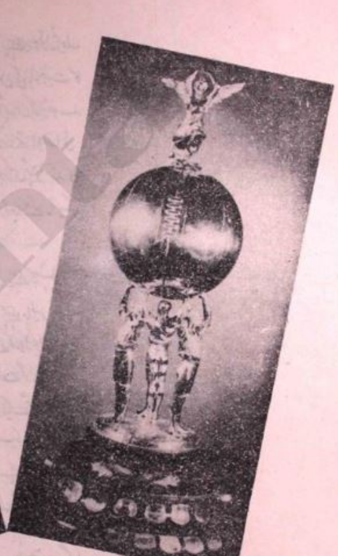
گول چوڑائی کے رُخ سے میدان کی باہری حد پر بالکل بیچ میں ہوتا ہے۔ گول دو سیدھی گاڑی اور اُوپر سے جُڑی بلّیوں سے بنے ہوتے ہیں۔ یہ لکڑی کے ہوتے ہیں۔ ان پر کالی اور سفید دھاریاں کھنچی ہوتی ہیں۔ ایک اور دوسرے کھمبے کا درمیانی فاصلہ آٹھ گز ہوتا ہے۔ گول آٹھ فٹ اُونچا ہوتا ہے۔ ۱۸۸۲ء تک گول اُوپر سے لکڑی کی بلّی سے جُڑے نہیں ہوتے تھے۔ بس ایک فیتہ سا باندھ دیا جاتا تھا۔ گول کے پیچھے ایک جال سا تنا رہتا ہے جس کا مقصد مجھے گول میں داخل ہونے کے بعد اِدھر اُدھر بھاگنے سے روکنا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ گول ہو گیا ہے۔ اس سے کھلاڑیوں کا وقت بھی ضائع نہیں ہوتا۔ وہ زیادہ وقت کھیل پاتے ہیں۔

لو یہ نقشہ ہے۔ اس سے تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ میرا میدان کیسا ہوتا ہے۔ کھلاڑی کھیل شروع ہونے سے پہلے لگ بھگ کہاں کھڑے ہوتے ہیں اور کیسے جاتے جاتے ہیں۔



دیکھا تو ایسا ہوتا ہے میرا میدان۔ اور یہ تو تمہیں معلوم ہی ہے — جو ٹیم مقابلے میں زیادہ گول کرتی ہے وہی مقابلہ جیتتی ہے اگر دونوں ٹیمیں برابر کی ہوں اور کوئی بھی ٹیم











گول نہ کرپائے یا برابر برابر گول کرپائیں تو پھر فیصلہ کیسے ہوتا ہے ؟ پہلے دونوں ٹیموں کو فاضل وقت کے لئے کھیلنے کو کہا جاتا ہے۔ کبھی کبھی اس پر بھی کھیل کی ہار جیت کا فیصلہ نہیں ہو پاتا، پھر ؟ ایک زمانہ تک یہ رواج رہا کہ سکّہ اچھال کر فیصلہ کرلیا جاتا تھا۔ یہ کوئی اچھا طریقہ نہیں تھا۔ یہ اچھا کھیلنے والی ٹیم کے ساتھ ناانصافی تھی کہ اس کی ہار جیت کا فیصلہ کسی ایسے طریقے سے ہو جو اپنے اندر کسی ہُنر مندی کی گنجائش نہ رکھتا ہو جس کی وجہ سے جیت ہار بس قسمت کی بات ہو کر رہ جائے۔ لیکن مجبوری تھی۔

پھر کارنر کِکوں کے شمار سے فیصلہ کیا جانے لگا۔ یہ طریقہ پہلے پہل اسکاٹ لینڈ میں شروع ہوا تھا۔ لیکن یہ بھی کچھ اچھا نہ تھا۔ اس لیے کہ پچھلے چالیس برسوں سے اچھی ٹیموں کے کھلاڑیوں کا ایک طریقہ رہا ہے : وہ مخالف ٹیم کے کھلاڑیوں کو بڑھ کر کھیلنے کا موقع دیتے ہیں۔ خود اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ مخالف گول پر چڑھ دوڑتے ہیں اور گول کر لیتے ہیں۔ اس طرح ہو سکتا ہے کارنر کِکیں تو ایک ٹیم زیادہ لگائے اور گول دُوسری ٹیم کرے۔ اس کی ایک تازہ مثال ۱۹۷۰ء میں میکسیکو میں ہوئے ورلڈ کپ ٹورنامنٹ میں برازیل کی ٹیم کے کھیل سے دی جا سکتی ہے۔ اُس برس ورلڈ کپ ٹورنامنٹ برازیل ہی نے جیتا تھا۔ اس لئے کارنر کِکوں کے شمار سے ہار جیت کا فیصلہ بھی کچھ ٹھیک نہیں تھا۔

ادھر پچھلے کچھ عرصے سے ایسی صورت میں فیصلہ ایک اور طریقے سے کیا جانے لگا ہے۔ یہ طریقہ ہے پنلٹی کِک کا۔ فیصلہ نہ ہو سکے پر دونوں ٹیمیں پانچ پانچ پنلٹی کِکیں لگاتی ہیں۔ اس میں ایک وقت میں، صرف دو کھلاڑیوں کی ہُنر مندی کام آتی ہے۔ پنلٹی کِک لگانے والے کھلاڑی کی اور گول کیپر کی۔ ایک کو مجھے گول کے اندر پھینکنا ہوتا ہے اور دوسرے کو مجھے گول کے اندر جانے سے روکنا ہوتا ہے۔ ہر پنلٹی کِک ایک دوسرا کھلاڑی لگاتا ہے — لیکن ہار جیت کا فیصلہ کرنے کے اس طریقے سے بھی میرے کھلاڑی اور ٹورنامنٹ کرانے والے کچھ بہت خوش نہیں۔ لیکن جب تک کوئی اور بہتر طریقہ نہ ڈھونڈ نکالا جائے، اس طریقے کو اپنانے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں — خیر — تو یہ تھیں میری اور میرے کھیل کی باتیں۔

ٹیمیں اور ٹورنامنٹ

ہاں - مجھے یاد ہے۔ میں نے تم سے ایک وعدہ کیا تھا - ورلڈ کپ ٹورنامنٹ کے بارے میں کچھ باتیں بتانے کا۔ تو سنو :

یہ ٹورنامنٹ ۱۹۳۰ء میں شروع ہوا تھا - لیکن کھیلوں کے عالمی مقابلوں میں مجھے ایک مقام اس سے پہلے مل گیا تھا - میری مُراد اولمپک کھیلوں سے ہے -

اولمپک کھیل ؟ اچھا اچھا - تو کچھ موٹی باتیں تمہیں اولمپک کھیلوں کے بارے میں بتائے دیتا ہوں - یہ تو تمہیں معلوم ہے : اولمپک کھیل ہر چار برس کے بعد ہوتے ہیں - اولمپک کھیلوں کی تاریخ لگ بھگ بیسویں صدی کے ساتھ شروع ہوتی ہے - دوسرے اولمپک کھیل ۱۹۰۰ء میں پیرس میں ہوئے تھے - ان میں میرے کھیل کو بھی شامل کیا گیا تھا - لیکن مقابلے کے لیے نہیں - عجیب بات ہے - بس نمائش کے لیے - اور اسی لیے کوئی انعام وغیرہ نہیں دیا گیا تھا - نمائش کے لئے کھیلا گیا یہ مقابلہ ایک برطانوی کلب اپٹن پارک نے فرانس کو چار گولوں سے ہرا کر جیتا تھا -

اوپر (بائیں سے)
عالمی کپ
شملہ ٹرافی
نیچے (بائیں سے)
ہیرالڈ کپ
ڈی سی ایم ٹرافی
ڈیورنڈ کپ

اچھے دن دُور نہ تھے — اور اولمپک کھیلوں میں مجھے بھی ایک باقاعدہ مقام مِل گیا - یہ بات ۱۹۰۸ء کی ہے۔ اس برس یہ کھیل لندن میں ہوئے تھے - بس تب سے میں اولمپک کھیلوں میں شامل رہا ہوں - ہاں ۱۹۳۲ء میں لاس اینجلز (امریکہ) میں ہوئے کھیلوں کو چھوڑ کر - ان کھیلوں میں میری مقبولیت کا اندازہ تم ایک اسی بات سے کر سکتے ہو کہ میرے پہلے مقابلے میں صرف پانچ ٹیمیں شامل ہوئی تھیں - ۱۹۵۲ء میں ایسی ٹیموں کی تعداد ۲۵ تک پہنچ گئی تھی - کھیلنے والی ٹیموں کی بھیڑ بھاڑ کو کم کرنے کے لیے میرے ابتدائی مقابلے علاقائی بنیادوں پر ہونے لگے - مقصد تھا : اصل اولمپک کھیلوں میں صرف ۱۶ ٹیمیں شریک ہوں -

تمہیں معلوم ہے نا — اولمپک کھیلوں میں حصہ لینے کی اجازت صرف شوقیہ کھلاڑیوں کو ہوتی ہے - اور یہ بھی کہ آج میرا کھیل پیشہ ور کھلاڑیوں کا کھیل بن گیا ہے - پیشہ ور کھلاڑی کون ہوتا ہے ؟ کیا پاتا ہے ؟ یہ سب باتیں میں تمہیں آگے چل کر بتاؤں گا - یہاں تو صرف ایک بات بتانا چاہتا ہوں — وہ یہ کہ اولمپک کھیلوں میں میرا مقابلہ جیتنے والی ٹیم ضروری نہیں کہ بڑے مقابلوں میں بھی کوئی بڑی کامیابی حاصل کر پائے - اس لیے کہ یہ مقابلے پیشہ ور کھلاڑیوں کے ہوتے ہیں -

ہاں تو بات ورلڈ کپ کی ہو رہی تھی - میرے لئے کھیلا جانے والا یہ دُنیا کا سب سے بڑا مقابلہ ہے - یہ ہر چار سال بعد کھیلا جاتا ہے - یہ ٹورنامنٹ میرے کھیل کی نگراں عالمی جماعت "فیڈریشن انٹرنیشنل دی فٹ بال ایسوسی ایشن" کراتی ہے - میرے کھیل کی نگراں یہ عالمی جماعت ۱۹۰۴ء میں بنی تھی - شروع میں اس جماعت کا ایک رُکن ایک فرانسیسی جولیس ریمے تھا - جولیس ریمے ہی کو میرے عالمی مقابلے کا خیال پیدا ہوا تھا - پہلا ورلڈ کپ ٹورنامنٹ ۱۹۳۰ء میں ہوا - اس کے لئے ٹرافی جولیس ریمے نے دی - یہ ٹرافی سونے کی ہے - اس کا وزن تقریباً ۵ر۲ کیلوگرام ہے - یہ ۱۲ انچ اُونچی ہے - یہ جولیس ریمے ٹرافی بھی کہلاتی ہے -

پہلا ورلڈ کپ ٹورنامنٹ جنوبی امریکہ کے ایک دیس اروگوئے میں ہوا تھا - اس بار کا اولمپک چیمپئن بھی اروگوئے تھا - اس پہلے ٹورنامنٹ میں ۱۳ ملکوں نے حصہ لیا - ان میں سے صرف چار یورپی ملک تھے - باقی جنوبی امریکہ کے تھے - جنوبی امریکہ میں کمی نہ میرے کھیلنے والوں کی تھی اور نہ میرے کھیل کی بے مثال مہارت رکھنے والوں کی - اس کا ایک بڑا ثبوت یہی ہے کہ ٹورنامنٹ کے فائنل میچ میں دونوں ٹیمیں جنوبی امریکہ کی تھیں ایک ارجن ٹائین کی اور ایک اروگوئے کی - جیت اروگوئے کی ہوئی تھی -

یہ مقابلہ شروع ہی سے بڑا مقبول ہوا - اگلے یعنی ۱۹۳۴ء میں ہوئے ٹورنامنٹ میں ۳۲ ملکوں نے حصہ لیا - یہ ٹورنامنٹ اٹلی میں ہوا تھا : جبھی ابتدائی مقابلے کا طریقہ اپنایا گیا تھا - مقصد تھا : اصل مقابلے کے لیے ٹیموں کی تعداد کم ہو کر سولہ رہ جائے - ابتدائی مقابلے کا یہ طریقہ آج بھی اپنایا جاتا ہے - یہ ٹورنامنٹ اٹلی نے جیتا - بلکہ اگلی بار بھی مقابلہ اٹلی کے ہاتھ رہا - اُس بار یعنی ۱۹۳۸ء میں یہ ٹورنامنٹ پیرس میں کھیلا گیا تھا -

پھر دوسری بڑی جنگ چھڑ گئی - کچھ سبب اور بن گئے -

اور یہ ٹورنامنٹ اگلے بارہ برسوں تک نہ کھیلا جا سکا۔ چوتھا ٹورنامنٹ ۱۹۵۰ء میں ہوا۔ انتظام کا اعزاز برازیل کو ملا۔ تمہیں ایک بات بتا دوں۔ میرے کھیل کے سلسلے میں برازیل کا بڑا نام ہے۔ اور آج اس کے کھلاڑیوں کی دھوم دُنیا بھر میں ہے۔ ہاں تو برازیل نے اس ٹورنامنٹ کے لیے ایک نیا اسٹیڈیم بنوایا۔ اس اسٹیڈیم کا گھیرا آدھا میل ہے۔ یہ دُنیا کا سب سے بڑا اسٹیڈیم ہے۔ اس میں ایک وقت میں دو لاکھ آدمی سما سکتے ہیں اور میرا کھیل دیکھ سکتے ہیں۔ فائنل اس بار بھی جنوبی امریکہ کے دو دیسوں ـــــ برازیل اور اروگوئے کے بیچ تھا۔ اسے اروگوئے نے جیتا ـــ کہتے ہیں اس مقابلے کو ۱۹۹۸۵۵ لوگوں نے دیکھا اور یہ کہ اتنی بڑی تعداد میں تماشائی پھر کسی مقابلے کو دیکھنے نہیں آئے۔ لیکن اب کھیل دیکھنے کی صورت بھی تو بدل گئی ہے۔ مثلاً ۱۹۷۴ء میں میونخ میں ہوئے عالمی کپ ٹورنامنٹ کا فائنل میچ صرف ۵۰ ہزار آدمی دیکھنے آئے تھے جبکہ ٹیلی وژن پر ۱۰۰۰۰ لاکھ آدمیوں نے یہ میچ دیکھا تھا۔ ۱۹۵۴ء میں یہ ٹورنامنٹ سوئٹزرلینڈ میں ہوا۔ اس بار ۳۵ ملکوں نے اس میں حصہ لیا۔ یہ ٹورنامنٹ اُس برس مغربی جرمنی نے جیتا۔ برازیل نے یہ ٹرافی پہلی بار ۱۹۵۸ء میں دوسری بار ۱۹۶۲ء میں اور تیسری بار ۱۹۷۰ء میں جیتی۔ ۱۹۶۶ء میں یہ ٹورنامنٹ ومبلے انگلینڈ میں کھیلا گیا تھا۔ اس برس ٹورنامنٹ انگلینڈ نے جیتا تھا۔ فائنل میں اُس کا مقابلہ مغربی جرمنی سے تھا۔ اس ٹورنامنٹ کی ایک بات بڑی دلچسپ ہے یہ اب تک دس بار کھیلا گیا ہے لیکن اُسے اب تک صرف پانچ ملکوں نے جیتا ہے۔ برازیل نے تین بار اروگوئے اٹلی اور مغربی جرمنی نے دو دو بار اور انگلینڈ نے ایک بار۔ اس کپ کی ایک خاص بات یہ ہے کہ یہ تیسری بار جیتنے والی ٹیم کی ملکیت بن جاتا تھا۔ ۱۹۷۰ء میں ورلڈ کپ ٹورنامنٹ کا فائنل اٹلی اور برازیل کے بیچ تھا۔ دونوں ملک دو دو بار یہ ٹورنامنٹ جیت چکے تھے۔ اب ٹرافی فائنل جیتنے والی ٹیم کی ملکیت بن جانی تھی۔ فائنل برازیل نے جیتا۔ اور اس طرح جولیس ریمے کپ برازیل کی ملکیت بن گیا۔ آئندہ ورلڈ کپ ٹورنامنٹ نئے کپ کے لیے کھیلا جائے گا۔

اب پانچ کیلو سونے اور ملاچائیٹ سے بنے نئے عالمی کپ کے بارے میں سنو۔ اس کپ کے لیے پہلا یعنی ۱۹۷۴ء کا عالمی کپ ٹورنامنٹ مغربی جرمنی کے شہر میونخ میں کھیلا گیا۔ شروع شروع میں پچھلے عالمی کپ چیمپئن برازیل سے بڑی اُمیدیں تھیں۔ لیکن یہ ٹیم چوتھے نمبر پر آئی۔ اب کے ٹورنامنٹ مغربی جرمنی نے جیتا۔ پچھلے بیس برسوں میں یہ اس کی دُوسری جیت ہے ہالینڈ رنراپ رہا۔ تیسرے نمبر پر پولینڈ کی ٹیم آئی۔

ماضی میں کھیل نے کچھ عجیب صورت اختیار کر لی تھی۔ ٹیمیں اور کھلاڑی اپنا سارا زور اس بات پر لگا دیتے تھے کہ دوسری ٹیم گول نہ کرنے پائے۔ گویا ساری توجہ گول بچانے پر صرف ہوتی تھی۔ لیکن اس بار مغربی جرمنی، ہالینڈ اور پولینڈ کی ٹیموں نے یہ ثابت کر دیا کہ گول بچانے سے کہیں زیادہ فائدہ گول کرنے کی کوشش میں ہے۔ اس کا سب سے اچھا ثبوت ہالینڈ کی ٹیم نے دیا۔

ٹورنامنٹ شروع ہونے پر کسی کو گمان تک نہ تھا

کہ ہالینڈ چیمپئن شپ کا اتنا زبردست دعویٰ دار ہوگا۔ ہالینڈ کے کھلاڑیوں اور اُن کے کھیل نے یہ ثابت کر دیا کہ مستقبل میں اسی انداز کے کھیل کا چلن ہوگا۔ اُن کے ہاف لائن کھلاڑی فارورڈ لائن کھلاڑیوں جیسی ہُنرمندی رکھتے ہیں۔ اور بہت سکون سے کھیلتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ اپنے پنلٹی بکس کے پاس بال ہونے پر بھی بوکھلاتے نہیں۔ اُن کی صفوں میں بھگدڑ نہیں مچتی۔ اور جب یہ کھلاڑی مخالف گول کی طرف بڑھتے ہیں تو آٹھ کھلاڑیوں کا ایک ریلا سا آجاتا ہے۔ یہ سبھی گول کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مخالف ٹیم کے کھلاڑی یہ نہیں جان پاتے کہ گول کون کرے گا۔ ایسے میں گول بچانا بے حد مشکل ہوتا ہے۔

کھیل کے ماہروں نے ہالینڈ کی اس ٹیم کو ماضی کی ہنگری کی ٹیم اور رئیل میڈرڈ کا ہم پلہ قرار دیا ہے۔ لیکن یہ دونوں ٹیمیں ڈچ کھلاڑیوں جیسے صفیں توڑنے والے حملے نہیں کر پاتی تھیں۔

ہاں ورلڈ کپ کے علاوہ بدیس میں میرے اور بھی اہم مقابلے ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک یورپین کپ کہلاتا ہے۔ یہ ٹورنامنٹ ۱۹۵۵ء میں شروع ہوا تھا۔ اب اس کا انتظام یورپین فٹ بال فیڈریشن کرتی ہے۔ یہ ہر سال کھیلا جاتا ہے۔ اس میں ملک نہیں بلکہ ٹیمیں شریک ہوتی ہیں اور ٹیمیں بھی وہ جو یورپی ملکوں میں لیگ چیمپئن ہوتی ہیں۔ لیکن یہ ٹورنامنٹ لیگ کے طریقے پر نہیں کھیلا جاتا۔ ایک بار ہارنے والی ٹیم مقابلے سے باہر نکل جاتی ہے۔

یورپین کپ کے علاوہ یورپ میں کھیلے جانے والے دُوسرے اہم مقابلوں میں سے یورپین نیشنز کپ اور یورپین انٹر کانٹی نینٹل چیمپئن شپ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

اچھا : اب کچھ باتیں ہندوستان میں کھیلے جانے والے بڑے بڑے ٹورنامنٹوں اور ہندوستان کی اچھی ٹیموں کے بارے میں ہو جائیں۔ میں یہ تو بتا ہی چکا ہوں کہ ہندوستان کا ایک پُرانا ٹورنامنٹ ٹریڈز کپ ہے۔ یہ پہلی بار ۱۸۸۹ء میں کھیلا گیا تھا۔ پھر ۱۸۹۳ء میں انڈین فٹ بال ایسوسی ایشن قائم ہوئی۔ اس ایسوسی ایشن نے ایک شیلڈ ٹورنامنٹ شروع کیا۔ یہ آئی ایف اے شیلڈ ٹورنامنٹ کہلاتا ہے۔ جب یہ ٹورنامنٹ پہلی بار کھیلا گیا تو اس میں صرف ایک ہندوستانی ٹیم سوا بازار کلب شامل ہوئی تھی۔ یہ کلب بابو کہلاتا تھا۔ یہی وہ پہلا ہندوستانی کلب تھا جس نے ٹریڈز کپ ٹورنامنٹ جیتا۔

پہلی ہندوستانی ٹیم جس نے یہ شیلڈ جیتی، موہن بگان تھی۔ فائنل میں اس کا مقابلہ مشہور یورپی فوجی ٹیم ایسٹ یارک شائر رجمنٹ سے تھا۔ وہ میچ دیکھنے کا تھا۔ اور اس سے زیادہ دیکھنے کی چیز تھی : لوگوں کا جوش وخروش۔ یہ تو میں پہلے بتا چکا ہوں : لوگوں میں میرا کھیل دیکھنے کا شوق پیدا ہو چلا تھا۔ اچھا بتاؤ تو کتنے لوگوں نے شیلڈ کا یہ فائنل دیکھا ہوگا۔ ۸۰۰۰۰ ! ہاں۔ اسّی ہزار لوگ یہ میچ دیکھنے آئے تھے لیکن سب نے میچ تو کیا دیکھا ہوگا۔ زیادہ تر لوگوں نے میچ کے بارے میں بس سُنا ہی ہوگا۔ وجہ ؟ اُن دنوں میرے میدان آج کے میدانوں جیسے بڑے اور سیڑھی دار نہیں ہوتے تھے۔ ایسے میں ظاہر ہے

اتنے سارے لوگ میچ نہیں دیکھ سکتے تھے۔ بعد میں آنے لوگوں کو میدان سے کافی دُور رُکنا پڑا ہوگا۔ کتنے ہی سارے لوگ آس پاس درختوں پر چڑھ گئے تھے۔ میدان سے دُور پیچھے، بہت پیچھے کھڑے لوگوں کو مایوسی تو ہوئی لیکن وہ بڑے پُرجوش تھے۔ چاہتے تھے: اگر وہ میچ دیکھ نہیں سکتے تو میچ کا حال ہی انہیں فوراً فوراً معلوم ہوتا رہے۔

آج ہم گھر بیٹھے ریڈیو سے کھیلوں کا آنکھوں دیکھا حال سُن کر لگ بھگ کھیل دیکھنے جیسا مزہ لے سکتے ہیں۔ کھیل ٹیلی ویژن پر بھی دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن ان دنوں صورت آج جیسی نہیں تھی۔ میچ دیکھنے آئے لوگوں کی بھیڑ بے حد تھی۔ پھر بھی ہر آدمی کو کھیل کی رفتار اور حالت کی کچھ نہ کچھ خبر برابر مِل رہی تھی۔ تم پوچھو گے، کیسے خبر مل رہی تھی؟ میں بتاتا ہوں۔ کھیل کے بارے میں خبریں پتنگ اُڑا اُڑا کر بھیجی گئی تھیں اور پھر جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ میچ موہن بگان ایک کے مقابلے میں دُو گول سے جیت گئی ہے تو لوگوں کا جوش اور بھی دیکھنے والا تھا۔ ہر شخص مارے خوشی کے اُچھل چیخ رہا تھا۔ کتنے سارے لوگوں نے تو مارے خوشی کے اپنے کپڑے تک پھاڑ ڈالے تھے۔ موہن بگان کی جیت کی خبریں ہندوستان اور لندن کے سبھی اخباروں میں خاص طور پر چھاپی گئیں۔ ہندوستان میں میری تاریخ کا یہ ایک اہم واقعہ تھا۔ موہن بگان نے یہ مقابلہ ۱۹۱۱ء میں جیتا۔ لیکن جانتے ہو، اس سے پچھلے برس جب وہ پہلی بار اس ٹورنامنٹ میں شریک ہوئی تو تیسرے ہی راؤنڈ میں ہار گئی تھی۔ اور یہ بات تب کی ہے، جب اس نے ٹریڈز کپ تیسری بار جیتا تھا۔

آئی ایف اے شیلڈ ٹورنامنٹ ہندوستان کا ایک بڑا ٹورنامنٹ ہے۔ یہ ہر برس اگست اور ستمبر میں کلکتہ میں کھیلا جاتا ہے۔ اس ٹورنامنٹ کی بڑی اہمیت ہے۔ اسے جیتنے والی ٹیم ہی عام طور پر ملک میں کھیلے جانے والے دوسرے بڑے ٹورنامنٹ جیتتی ہے۔ مثال کے طور پر اِس برس یعنی ۱۹۷۲ء میں یہ شیلڈ کلکتہ اور ہندوستان کی مشہور ٹیم ایسٹ بنگال نے جیتی۔ ایسٹ بنگال ہی کلکتہ لیگ چیمپین رہی۔ ڈیورنڈ فٹ بال ٹورنامنٹ بھی اُسی نے جیتا۔ البتہ روورس ٹورنامنٹ کے سیمی فائنل میں وہ بمبئی کی ہارورڈ لیگ چیمپین مہندرا اینڈ مہندرا سے ہار گئی۔ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ملک کے چار بڑے ٹورنامنٹ میں سے تین ایسٹ بنگال نے جیتے۔

ایسٹ بنگال ہی وہ پہلی ہندوستانی ٹیم ہے، جس نے آئی ایف اے شیلڈ ٹورنامنٹ لگاتار چار بار اور اب تک کُل چودہ بار جیتا ہے۔ لیکن ۱۹۷۲ء میں اس کی جیت خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اُس برس شاید پہلی بار دُو غیر ملکی ٹیمیں شیلڈ کے مقابلے میں شریک ہوئی تھیں۔ ایک ٹیم مغربی جرمنی کی تھی۔ دوسری ایران کی مشہور ٹیم پاس کلب تھی۔ ٹورنامنٹ کے شروع میں عام خیال یہ تھا کہ فائنل مغربی جرمنی اور ایران کی ٹیموں کے درمیان پڑے گا۔ لیکن کوارٹر فائنل میں تاریخ ساز محمڈن اسپورٹنگ نے مغربی جرمنی کی ٹیم کو ہرا کر ہوا کا رُخ بدل دیا۔ تاہم سیمی فائنل میں ایسٹ بنگال سے نہ جیت سکی۔ دوسری طرف ایران کا پاس کلب دُوسرے سیمی فائنل میں موہن بگان کو ہرا کر شیلڈ کے فائنل میں پہنچ چکا تھا۔ اب فائنل پاس کلب اور ایسٹ بنگال کے بیچ تھا۔ یہ میچ ایسٹ بنگال نے جیتا۔

فائنل کا کھیل کیسا رہا ہوگا؟ بڑا زبردست۔ اور پتہ ہے۔ پچھلے برسوں کے مقابلے میں دو گنے سے زیادہ آدمی یہ میچ دیکھنے کو آئے تھے۔ ان کا جوش اور اُن کی خوشی، دونوں دیکھنے کی چیزیں تھیں۔ اور اس وجہ سے ایسی صورت پیدا ہوگئی تھی کہ جیتنے والی ٹیم کو شیلڈ اور کھلاڑیوں کو دوسری ٹرافیاں تک پیش نہ کی جا سکیں۔

تمہیں ایک دلچسپ بات بتاؤں — جیسا کہ تم جانتے ہو: اُس برس اس ٹورنامنٹ میں دو باہری ٹیمیں بھی شامل ہوئی تھیں۔ لیکن شاید تم نہیں جانتے کہ اس ٹورنامنٹ کے قاعدے کے مطابق یہ شیلڈ ہندوستان سے باہر نہیں لے جائی جا سکتی۔ اب تم پوچھو گے: اگر ایرانی ٹیم جیت گئی ہوتی تو کیا ہوتا؟ جواب ہے: اگر ایرانی ٹیم جیت جاتی تو بھی اُسے یہ شیلڈ نہ ملتی۔ تم کہو گے یہ کیا بات ہوئی؟ ہاں۔ ایرانی ٹیم کو یہ شیلڈ تو نہ ملتی لیکن اس شیلڈ کا بالکل اس شیلڈ جیسا نمونہ ضرور مل جاتا۔ اور نمونے کی شیلڈ تیار بھی کرائی گئی تھی۔ لیکن اس کے دیئے جانے کی نوبت نہ آئی۔

۱۹۷۳ء میں ایسٹ بنگال بیسویں بار شیلڈ کے فائنل میں پہونچی تھی۔ اس بار بھی اُس کا مقابلہ ایک غیر ملکی — کوریا کی پیونگ یانگ سٹی کلب سے پڑا تھا۔ اس بار بھی فائنل ایسٹ بنگال ہی نے جیتا۔ اس کے فارورڈ کھلاڑیوں حبیب، اکبر اور بھومک نے بے حد اچھا کھیل دکھایا۔ خیر، تو ایسٹ بنگال کے علاوہ جن دُوسری ٹیموں نے یہ شیلڈ اور ملک کے دوسرے اہم مقابلے جیتے ان میں ملک کی مشہور ٹیمیں موہن بگان، محمڈن اسپورٹنگ، آرین، راجستھان کلب وغیرہ شامل ہیں۔

کلکتہ ہی میں میرا ایک دوسرا اہم مقابلہ کلکتہ فٹ بال لیگ ہے۔ یہ ۱۸۹۸ء سے کھیلا جا رہا ہے۔ شروع شروع میں اس لیگ میں بھی صرف یورپی ٹیمیں شامل ہوا کرتی تھیں۔ یہ لیگ دو ڈویژنوں میں کھیلا جاتا تھا۔ لیگ کے فرسٹ ڈویژن میں ترقی پانے کے قاعدے ایسے کڑے تھے کہ ہندوستانی ٹیمیں اس میں مشکل ہی سے شامل ہو سکتی تھیں۔ پہلی ہندوستانی ٹیم جو اس مقابلے میں پہنچی، وہ شیلڈ چیمپین موہن بگان تھی۔ فرسٹ ڈویژن لیگ میں میرے کھلاڑی اور کھیل دیکھنے کے شوقین دونوں بڑی دلچسپی رکھتے ہیں۔ آئی ایف اے شیلڈ اور لیگ دونوں کو ایک ساتھ جیتنا بڑی بات سمجھا جاتا ہے۔ پہلی ہندوستانی ٹیم کلکتہ فٹ بال کلب تھی جس نے یہ کارنامہ سر کیا۔ ایسی دوسری ٹیم موہن بگان تھی۔ موہن بگان نے یہ مقابلہ پہلی بار ۱۹۳۹ء میں جیتا تھا۔ لیکن لیگ میں شاندار کارنامہ محمڈن اسپورٹنگ نے سر کیا۔ اس ٹیم نے ۱۹۳۴ء سے ۱۹۳۸ء تک لگاتار پانچ بار یہ مقابلہ جیتا۔ اس کارنامے کی ہمسری کا شرف ایسٹ بنگال کو حاصل ہے۔ اس ٹیم نے ۱۹۷۰ء سے ۱۹۷۴ء تک لگاتار پانچ بار یہ مقابلہ جیت کر کھیل کے شوقینوں کا دل بھی جیت لیا۔

۱۹۷۵ء میں ایسٹ بنگال اور محمڈن کے درمیان کڑے مقابلے کے آثار تھے۔ ایسٹ بنگال اور ملک کے دو بے حد اچھے فارورڈ کھلاڑی حبیب اور اکبر محمڈن میں چلے گئے تھے۔ اس کے علاوہ محمڈن میں حیدرآباد سے ایک نیا رائٹ آؤٹ سجاد

بھی آیا تھا ۔ نعیم، چندن، اگپتا، اور سردار خاں جیسے اچھے کھلاڑی پہلے ہی محمڈن میں موجود تھے۔

دوسری طرف ایسٹ بنگال نے اپنا پُرانا کھلاڑی شیام تھاپا پھر حاصل کر لیا ہے۔ مقابلہ ایسٹ بنگال نے جیتا لیکن فیصلہ کشاکشی میں پڑ گیا۔

ایک دوسرا مقابلہ روورس کپ ٹورنامنٹ ہے۔ یہ بمبئی میں کھیلا جاتا ہے۔ یہ ٹورنامنٹ ایک برطانوی کلب نے اپنے یعنی روورس کے نام سے ۱۸۹۱ء میں شروع کیا تھا۔ دوسرے ٹورنامنٹوں کی طرح اس ٹورنامنٹ پر بھی ایک لمبے عرصے تک برطانوی ٹیمیں چھائی رہیں۔ پہلی ہندوستانی ٹیم جس نے یہ کپ جیتا بنگلور مسلمز تھی۔ یہ بات ۱۹۳۷ء کی ہے۔ اُن دنوں بنگلور مسلمز ملک کی اچھی ٹیموں میں شمار ہوتی تھی۔ اس کی دھوم بہت دنوں تک رہی۔ ۱۹۳۸ء میں بھی روورس اُس نے جیتا تھا۔ لیکن روورس کپ ٹورنامنٹ کی تاریخ کا سب سے اہم نام حیدر آباد پولیس ہے۔ اس ٹیم نے یہ کپ لگاتار پانچ بار (۱۹۵۰-۵۴ء) جیتا۔ یہ بے مثال کارنامہ وہ اپنے اچھے کھیل، اپنے کھلاڑی اور اچھے کوچ رحیم کی وجہ سے انجام دے پائی تھی۔ بمبئی کی جن ٹیموں نے یہ ٹورنامنٹ جیتا وہ ہیں — مفت لال گروپ اور کال ٹیکس۔ کال ٹیکس نے ۱۹۵۸ء میں اور مفت لال گروپ نے ۱۹۶۵ء میں یہ ٹورنامنٹ جیتا تھا۔ ۱۹۷۰ء اور ۱۹۷۱ء میں بھی روورس کپ موہن بگان نے جیتا۔ ۱۹۶۸ء میں بھی یہ کپ اس نے جیتا تھا۔ ۱۹۶۹ء مقابلہ ایسٹ بنگال کے ہاتھ رہا تھا۔ ۱۹۷۲ء میں ایسٹ بنگال اور موہن بگان کی ٹیمیں ساجھی چیمپئن قرار پائیں۔ ۱۹۷۴ء کا ٹورنامنٹ گوا کی ڈیمپو اسپورٹس کلب نے جیتا۔

۱۹۷۲ء میں ڈیورنڈ چیمپئن بھی ایسٹ بنگال رہی۔ فائنل میں اس کا مقابلہ موہن بگان سے تھا۔ پچھلے دس برسوں میں اس ٹورنامنٹ کے فائنل میں موہن بگان سے اس کا یہ تیسرا مقابلہ تھا — پہلا ۱۹۶۰ء میں پڑا۔ اس میں دونوں ٹیمیں ساجھی چیمپئن قرار پائیں۔ پھر ۱۹۶۴ء میں ——— اس برس اسے موہن بگان نے جیتا۔ ۱۹۷۴ء میں بھی یہ ٹورنامنٹ موہن بگان نے جیتا۔ فائنل میں اس نے پھگواڑہ کی جگجیت کاٹن ملز کو ہرایا تھا۔ ملک کا موجودہ سب سے اچھا فارورڈ کھلاڑی اندر سنگھ اب اسی ٹیم میں کھیلتا ہے۔ موہن بگان اس ٹورنامنٹ کے فائنل میں نو بار پہونچی اور سات بار جیتی ہے۔ وہ پہلی ہندوستانی ٹیم ہے جس نے لگاتار تین برس (۱۹۶۳-۱۹۶۵ء) یہ کپ جیتا۔ ۱۹۷۲ء میں یہ ٹورنامنٹ بارڈر سکیورٹی فورس نے بیکانیر کی آر۔ اے۔ سی کو ہرا کر جیتا۔ ۱۹۷۵ء میں بھی کامیابی کا سہرا بارڈر سکیورٹی فورس کے سر رہا۔

یہ ٹورنامنٹ شملہ میں ۱۸۸۸ء میں شروع ہوا۔ میرے دوسرے مقابلوں کی طرح یہ مقابلہ بھی شروع شروع میں یورپی ٹیموں اور وہ بھی فوجی ٹیموں کے لئے تھا۔ بعد میں اس میں غیر فوجی ٹیمیں بھی شامل کی جانے لگیں۔ لیکن یہ کپ پچاس سے زیادہ برسوں تک فوجی ٹیموں ہی نے جیتا۔ جس ہندوستانی

ٹیم نے اُسے پہلی بار جیتا وہ کلکتہ کی محمڈن اسپورٹنگ تھی۔

سچ پوچھو تو اس ٹورنامنٹ کی تاریخ بڑے پُرجوش لمحوں اور بڑے پُرجوش مقابلوں سے عبارت ہے۔ ایسا ہی ایک مقابلہ ۱۹۴۰ء میں دیکھنے میں آیا۔ اس برس ایک غیر فوجی ٹیم ایک بار پھر اس ٹورنامنٹ کے فائنل میں پہونچی تھی۔ وہ برس اس لحاظ سے بھی بڑا تاریخی ہے کہ ڈیورنڈ بجائے شملہ کے پہلی بار دہلی میں کھیلا گیا تھا۔ اس برس فائنل میچ کا ریفری بھی پہلی بار ایک ہندوستانی تھا۔ وہ ریفری تھا: دہلی کا مقبول کھلاڑی ہرنام سنگھ۔ اس برس یہ ٹورنامنٹ دہلی گیٹ کے قریب مغل گراونڈ میں کھیلا گیا تھا۔ لیکن عجیب بات ہے: فائنل میچ انڈیا گیٹ کے قریب اِروِن امپی تھیٹر میں ہوا۔ ریفری ہرنام سنگھ کا خیال تھا کہ دہلی گیٹ کے قریب مغل گراونڈ میں اس میچ کے کھیلے جانے پر پُرجوش تماشائی کھیل کو ڈھنگ سے نہ ہونے دیں گے۔ اور انڈیا گیٹ چونکہ شہر سے بہت دُور ہے، اس لئے زیادہ لوگ نہیں آئیں گے۔ لیکن اُن کا یہ خیال غلط نکلا۔ میرا کھیل دیکھنے کا شوق رکھنے والوں کے لیے یہ کوئی اُلجھن کی بات نہ تھی۔ وہ کیسے رُکتے۔ وہ ہزاروں کی تعداد میں سائیکلوں پر، تانگوں میں اور پیدل چل کر فائنل دیکھنے پہونچے۔

بھئی گھبراؤ نہیں اور جلدی بھی نہ مچاؤ۔ اس تاریخی فائنل میچ کا حال میں تمہیں تفصیل سے بتائے دیتا ہوں۔

ہاں تو فائنل میں محمڈن اسپورٹنگ کا مقابلہ رائل وارک شائر رجمنٹ سے تھا۔

محمڈن اسپورٹنگ کے کھلاڑی بڑے بھروسے کے ساتھ میدان میں آئے۔ اُن کا یہ بھروسہ کچھ بیجا نہیں تھا۔ وہ اس سے پہلے لیگ چیمپئن شپ اور روورس کپ بھی جیت چکے تھے۔ وہ بڑا جم کر کھیلے۔ گول میں علی حسین سا تجربہ کار کھلاڑی تھا۔ بیک جمعہ خاں اور یحییٰ خاں تھے۔ یہ وہی جمعہ خاں ہے بعد کو جس کے اچھے کھیل کی کہانیاں چل پڑیں۔ اور یحییٰ خاں —— اس کے کھیل کا جواب نہیں تھا۔ لیکن وہ بڑی جلدی غصے میں آجاتا تھا۔ ہوا یوں کہ سیمی فائنل میں محمڈن اسپورٹنگ کا مقابلہ ایک ویلش ٹیم سے تھا۔ اس میں کسی بات پر یحییٰ خاں کی ایک ویلش کھلاڑی سے گرما گرمی ہو گئی۔ نوبت دھول دھپے تک پہونچی۔ بعد میں ریفری نے دونوں کو ہاتھ ملانے کو کہا اور اُن کے ایسا نہ کرنے پر دونوں کو میدان سے باہر چلے جانے کا حکم دے دیا۔ تو خیر جمعہ خاں اور یحییٰ خاں مخالف ٹیم کے کھلاڑیوں کے لیے کسی چٹان سے کم نہ تھے۔ ہاف لائن میں عثمان، رشید خاں اور معصوم تھے۔ فارورڈ تھے: نور محمد، کریم، حافظ رشید، صابو اور رحمان۔ حافظ رشید میرا بڑا اچھا کھلاڑی تھا۔ وہ گول کرنے میں بڑا ماہر تھا اور دائیں بائیں دونوں پیروں سے ایک جیسی خوبی سے کھیل سکتا تھا۔ وہ سچ مچ میرا اُستاد تھا۔ جیسے اور جہاں چاہتا، مجھے پھینکتا تھا اور اگر صابو مجھے اپنے پیروں میں رکھنا چاہتا تو کسی دوسرے کھلاڑی کی کیا مجال کہ مجھے اس سے چھین جھپٹ لے۔

دونوں ٹیمیں جم کر کھیل رہی تھیں۔ نور محمد نے ایک موقع سے فائدہ اٹھایا اور مجھے گول میں پھینک دیا۔ ایسا ہاف ٹائم سے بس ذرا سا پہلے ہوا۔ لیکن پھر جیسے ہی کھیل شروع ہوا، وارک شائر کے کھلاڑی ورین نے گول اُتار دیا۔ نتیجے میں

کھیل میں اور تیزی آگئی۔ دونوں ٹیموں کے کھلاڑی بڑھ کر کھیل رہے تھے۔ میچ ختم ہونے میں ابھی دس منٹ باقی تھے۔ ایک شاندار تحریک ہوئی۔ اب میں صابو کے اختیار میں تھا۔ اس نے موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دیا اور مجھے گول میں دھکیل دیا۔ اس سے جہاں محمڈن اسپورٹنگ کے کھلاڑیوں کے حوصلے بڑھے، وہاں وارو ک شائر کے کھلاڑی جی چھوڑ بیٹھے۔ ایسے میں گول اُتارنا بہت مشکل تھا اور ان کے بہترین فارورڈ ہیرس کے زخمی ہونے کی صورت میں تو یہ ناممکن سا تھا — میچ ختم ہوا۔ ٹورنامنٹ پہلی بار ایک غیر فوجی ٹیم نے جیتا تھا۔ اور وہ ٹیم تھی محمڈن اسپورٹنگ۔

محمڈن اسپورٹنگ سے پہلے چار غیر فوجی ٹیمیں ایسی تھیں جو اس کپ کے فائنل میں پہنچی تھیں لیکن مقابلہ چاروں بار فوجی ٹیموں نے جیتا تھا۔ پہلی غیر فوجی ٹیم شملہ ایلے ون تھی۔ جو ۱۸۸۹ء میں فائنل میں پہونچی تھی۔ لیکن یہ ٹیم بہت بُری طرح ہاری تھی۔ اس کی مخالف ٹیم ہائی لینڈ لائٹ ان فین ٹری تھی، جس نے آٹھ گول کیے، جبکہ یہ صرف ایک ہی گول اُتار پائی۔ محمڈن اسپورٹنگ سے پہلے نارتھ ویسٹرن ریلوے لوکو کلب ۱۹۲۹ء میں فائنل میں پہونچا تھا۔

پھر دوسری بڑی لڑائی چھڑ گئی۔ پھر ملک تقسیم ہوا۔ نتیجے میں ۱۲ برسوں تک یہ ٹورنامنٹ نہ کھیلا جا سکا۔ پھر یہ ۱۹۵۰ء میں شروع ہوا۔ تب سے محمڈن اسپورٹنگ اس ٹورنامنٹ میں برابر شرکت کر رہی ہے۔ لیکن پھر وہ یہ مقابلہ کبھی نہیں جیت پائی — ہاں ۱۹۵۹ء میں وہ فائنل میں ضرور پہونچی تھی اور اس کا مُقابلہ موہن بگان سے پڑا تھا۔ اس برس محمڈن اسپورٹنگ میں کچھ باہر کے (پاکستانی) کھلاڑی بھی شامل تھے۔ لیکن مقابلہ موہن بگان نے جیتا۔ تاریخ ساز محمڈن اسپورٹنگ اپنا یہ کارنامہ کب دُہرائے گی؟ اس کا جواب صرف وقت دے گا۔

میں پہلے بتا چکا ہوں: شروع میں لگ بھگ پچاس برس تک فوجی ٹیمیں اس ٹورنامنٹ پر چھائی رہی تھیں۔ آزادی کے بعد بھی فوجی ٹیموں نے اس ٹورنامنٹ میں اچھا کھیل دکھایا اور کئی بار یہ ٹورنامنٹ جیتا ہے۔ ایسی ٹیموں میں مدراس رجمنٹ، گورکھا بریگیڈ اور بارڈر سیکیورٹی فورس کی ٹیموں کے نام خاص طور پر لیے جا سکتے ہیں۔ ملک کی جن دوسری ٹیموں نے اس ٹورنامنٹ میں اپنا نقش جمایا، ان میں انڈین ایر فورس، ہندوستان ایرکرافٹ، راجستھان کلب، مفت لال گروپ، لیڈرز کلب، راجستھان آرمڈ کانسٹبلری، سکھ رجمنٹل سینٹر اور آندھرا پولیس شامل ہیں۔

ہندوستان میں فٹ بال کا ایک دوسرا اہم ٹورنامنٹ سنتوش ٹرافی ٹورنامنٹ ہے۔ یہ مقابلہ ملک میں کھیلے جانے والے دوسرے مقابلوں سے مختلف ہے۔ اس میں ملک کی مختلف ٹیمیں نہیں، بلکہ ریاستوں کی ٹیمیں اور فوجی ٹیمیں حصہ لیتی ہیں۔ یہ ٹرافی نیشنل چیمپین شپ کے لیے دی جاتی ہے۔ یہ ٹرافی مرحوم مہاراجہ سنتوش کے نام پر ہے۔ مہاراجہ سنتوش میرے بڑے قدر دان تھے۔ وہ بہت دنوں انڈین فٹ بال ایسوسی ایشن کے صدر رہے۔ ہندوستان بھر میں میرے کھیل کی نگران جماعت آل انڈیا فٹ بال فیڈریشن کو بنانے میں بھی انہوں نے بڑا حصہ لیا تھا۔ یہ ٹرافی انڈین فٹ بال ایسوسی ایشن نے ۱۹۴۰ء میں آل انڈیا فٹ بال فیڈریشن کو پیش کی تھی اور فرمائش کی تھی کہ اس کا نام مہاراجہ سنتوش کے نام پر رکھا جائے۔

ملک کا یہ اہم ترین سالانہ ٹورنامنٹ ۱۹۴۱ء سے کھیلا جا رہا ہے۔ دوسرے مُقابلوں کی بہ نسبت اس ٹورنامنٹ میں عام طور پر بہت اچھا کھیل دیکھنے کو ملتا ہے۔ ہر ریاست کی ٹیم میں اس ریاست کے چُنے ہوئے کھلاڑی شامل ہوتے ہیں۔ ملک کے دوسرے ٹورنامنٹوں کی طرح نیشنل چیمپین شپ کے اس مقابلے میں بھی بنگال چھایا رہتا ہے۔ یہ ٹورنامنٹ اب تک ۳۲ بار کھیلا گیا ہے۔ بنگال کی ٹیم اس کے فائنل میں ۲۴ بار پہونچی اور ۱۵ بار جیتی ہے۔ ۱۹۷۰ء میں بھی فائنل میں اس کا مقابلہ پنجاب کی مضبوط ٹیم سے تھا۔ لیکن اس کے ہارنے کی کوئی اُمید نہ تھی۔ اس لیے کہ اس کی طرف سے ہندوستان کے بہترین کھلاڑی تھنگ راج، نعیم، سہا، مترا، الطاف، لطیف، بھومک، گھوش دستی دار، حبیب اور شام تھاپا کھیل رہے تھے۔

پہلے دن کے میچ میں دونوں ٹیمیں کوئی گول نہیں کر پائی تھیں۔ دوسرے دن کا کھیل بہت مقابلے کا رہا۔ کچھ اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا کہ کون سی ٹیم جیتے گی۔ پھر بھی ایسا لگتا تھا: میچ بنگال کی ٹیم جیتے گی۔ بنگال کی ٹیم کے فارورڈ اتنا بڑھ کر کھیل رہے تھے کہ کسی بھی پل گول ہو سکتا تھا۔ اور ۳۰ ویں منٹ میں ایسا ہی ہوا۔ حبیب اور گھوش دستی دار مجھے ایک دوسرے کی طرف پھینکتے ہوئے پنجاب ٹیم کے گول کی طرف بڑھے۔ تماشائیوں کے سانس رُک سے گئے تھے۔ حبیب نے پلک جھپکتے ہی مجھے پنجاب کے بیک سے آگے بڑھا کر پھینکا۔ گھوش دستی دار جیسے تیار ہی کھڑا تھا۔ اس نے لپک کر مجھے لیا اور آگے بڑھا۔ گول کیپر جرنجیت نے روکنے کی کوشش کی لیکن — ایک میں خود گول میں پہونچنے کا خواہش مند، دُوسرا گھوش دستی دار سا میرا کھلاڑی۔ ایسے میں جرنجیت مجھے کیا روکتا۔ دستی دار نے کک لگائی میں گول کے اندر تھا — تماشائی حیران کے حیران رہ گئے تھے۔ پنجاب کے کھلاڑیوں کے حوصلے پل بھر کے لئے پست ہو گئے۔ لیکن اُن کے لیے نہ میں نیا تھا اور نہ میرا کھیل۔

کھیل پھر شروع ہوا۔ پنجاب کے کھلاڑیوں نے بہت چاہا پر گول نہ ہوا۔ جہاں بنگال کے کھلاڑیوں نے گول کرنے کے دو اچھے موقعے کھوئے۔ وہاں پنجاب کے کھلاڑی منجیت نے کئی موقعے گنوا کر بہت بے مزہ کیا۔ کھیل کا لگ بھگ فیصلہ ہو چکا تھا۔ پنجاب کی اُمیدوں پر پانی پھر چکا تھا۔ کھیل ختم ہونے میں بس دو منٹ باقی تھے۔ کھیل نے اچانک پلٹا کھایا۔ میں منجیت کے پاس آیا۔ وہ مجھے کرم کار اور سہا سے بچاتا ہوا گول کی طرف بڑھا۔ جگجی اس کے ساتھ تھا۔ گول کیپر تھنگ راج نے بڑھ کر اُسے روکنا چاہا۔ منجیت نے پیر سے مجھے دبایا — تھنگ راج اپنا توازن کھو چکا تھا۔ بس منجیت نے مجھے اُچھال کر گول میں جال کے اندر پھینک دیا۔ تماشائیوں نے کس قیامت کا شور مچایا تھا۔ پنجاب کے کھلاڑیوں نے منجیت کو گلے لگا لیا تھا۔

کھیل پھر شروع ہوا۔ اب کھیل میں ایک نئی زندگی پیدا ہو گئی تھی۔ لیکن رُخ پلٹ چکا تھا۔ پھر کھیل ہار جیت کے

فیصلے کے بغیر ختم ہوگیا۔ پھر فیصلے کے لیے پنلٹی کک کا طریقہ اپنایا گیا۔ یہ اس معنی میں تاریخی واقعہ ہے کہ نیشنل چمپین شپ کے مقابلے میں یہ طریقہ پہلی بار اپنایا گیا تھا۔

اس فیصلے پر ایسا لگا: جیسے بنگال کی ٹیم اس کے لیے تیار نہیں تھی۔ پھر نعیم جیسے تجربہ کار کھلاڑی سے ایک چوک بھی ہوئی۔ پنلٹی کک پہلے کون لگائے؛ اس کا فیصلہ پہلے ہونا تھا سِکہ اچھالا گیا۔ قسمت نے بنگال کا ساتھ دیا۔ ٹاس نعیم نے جیتا۔ غلطی یہ کی کہ پنجاب کی ٹیم کے کھلاڑی جرنیل سنگھ کو پہلے پنلٹی کِک لگانے کی دعوت دے دی۔ پنجاب ٹیم کے کھلاڑی بڑے پُرامید دکھائی دے رہے تھے۔ جیسے یہ موقع پیش آنے کی اُنھیں پوری اُمید تھی اور وہ اس کے لیے تیار بھی تھے۔ ظاہر ہے: ایسے میں نتیجہ کیا ہو سکتا تھا۔ پنجاب جیت گیا۔ لیکن یہ نتیجہ کیسے نکلا؛ اس کی تفصیل بھی بڑی دلچسپ ہے۔

اب ٹیم کو نہیں بلکہ کھلاڑیوں کو اپنا کمال دکھانا تھا اور اس موقع پر یہ ظاہر ہوگیا کہ پنجاب کا گول کیپر جرنجیت ہی اس مقابلے کا ہیرو تھا۔ پہلی پنلٹی کک پنجاب ٹیم کے بیک اور ہندوستان کے مشہور کھلاڑی جرنیل سنگھ نے لگائی۔ تھنگ راج کچھ نہ کر پایا۔ بال گول کے اندر تھا۔ اب بنگال کی ٹیم کے کھلاڑی کی باری تھی۔ کِک نعیم نے لگائی۔ کِک بہت اچھی لگی۔ لیکن جرنجیت نے بڑھ کر گیند کو گول میں جانے سے روک دیا۔ گول نہ ہو پایا۔ دوسری کک پنجاب کے کھلاڑی منجیت نے لی۔ کک بہت نیچی تھی۔ تھنگ راج روک نہ پایا اور اس طرح بنگال پر ایک اور گول ہوگیا۔ اب پھر بنگال کی باری تھی۔ کک کر اُسے روکنے میں کمال کر دیا۔ بنگال کی ٹیم اس طرح دو موقعے گنوا چکی تھی۔ پھر سنگھا نے کک لگا کر اسکور "۲-۱" کر دیا۔ اس پر بنگال ٹیم کے لیے لطیف نے بہت زور سے پنلٹی کک لگائی مگر بے فائدہ۔ جرنجیت اب کے بھی گول بچانے میں کامیاب رہا تھا۔ بنگال کی ٹیم تین موقعے گنوا چکی تھی۔ میچ ہار چکی تھی۔ پنجاب کے لیے چوتھی پنلٹی کک کیشو نے لگائی اور گول کر دیا۔ اب پنجاب کی ٹیم پانچ گول کر چکی تھی جبکہ اُس کے خلاف صرف ایک گول ہوا تھا۔ بنگال کی ٹیم کے لیے باقی دو پنلٹی ککیں گھوش دستی دار اور تھنگ راج نے لگائیں۔ اور ان دونوں بار جرنجیت گول نہ بچا پایا۔ پنجاب کی ٹیم نے پانچ اور بنگال کی ٹیم نے تین گول کیے۔ پنجاب کے لیے آخری پنلٹی کک عجائب سنگھ نے لی جو ضائع ہو گئی۔ میچ پنجاب کی ٹیم نے جیت لیا تھا۔

فائنل میں اس کا مقابلہ میسور کی ٹیم سے تھا۔ اس سے پہلے میسور کی ٹیم اس ٹورنامنٹ کے فائنل میں سات بار پہونچی اور چار بار فائنل جیت چکی تھی۔ اب بھی اگرچہ اس کی ٹیم میں کئی اور امجد جیسے کھلاڑی شامل تھے، لیکن وہ پنجاب کے کھلاڑیوں کی رفتار، بڑھ کر کھیلنے، دفاعی صفوں کو بار بار چیرنے اور مخالف کھلاڑیوں کو اپنے گول کے پاس نہ آنے دینے کی صلاحیت کا کوئی جواب نہ رکھتی تھی — اور جیسا کہ خیال تھا وہ فائنل میں ایک کے مقابلے میں تین گولوں سے ہار گئی۔ اور اس طرح پنجاب کی جیت سے اس ٹرافی کی تاریخ میں ایک نیا باب شروع ہوا۔

پنجاب کی یہ کامیابی سچ پوچھو تو چار آدمیوں کا حصہ شری دوارکاداس سہگل کا۔ جالندھر میں اس ٹورنامنٹ کے انتظام، پنجاب ٹیم کی تربیت اور تیاری شری سہگل کا کارنامہ ہے۔ انہیں ریاست پنجاب کا "شری فٹ بال" ٹھیک ہی کہا جاتا ہے۔ دوسرا نام جرنیل سنگھ کا ہے۔ جرنیل سنگھ نے اس ٹیم کے کھلاڑیوں کی تربیت کی تھی اور اپنے اچھے کھیل سے بھی یہ ٹورنامنٹ جیتنے میں پنجاب کا ہاتھ بٹایا تھا۔ جرنیل سنگھ کبھی موہن بگان میں کھیلتا تھا۔ وہ ہندوستان کی طرف سے کئی عالمی اور ایشیائی مقابلوں میں کھیل چکا ہے۔ اب وہ آل انڈیا فٹ بال فیڈریشن کا سلیکٹر یعنی باہری مقابلوں میں شریک ہونے والی ہندوستانی ٹیم کے لیے کھلاڑی چننے والی کمیٹی کا ممبر ہے۔ وہ فٹ بال کے بڑے مقابلوں سے ریٹائر ہو چکا ہے۔ اور اب پنجاب میں میرے کھلاڑیوں کی تربیت کرتا ہے۔

تیسرا شخص منجیت ہے۔ اُس نے گول کرنے کے کئی موقع گنوائے لیکن ایک گول کر کے پنجاب کے لیے جیتنے کا موقع بھی اُسی نے پیدا کیا۔

آخری لیکن شاید سب سے زیادہ ضروری نام پنجاب کے گول کیپر جرنجیت کا ہے جس نے نعیم، الطاف اور لطیف جیسے اچھے کھلاڑیوں کی پنلٹی ککوں کو روک کر کمال کر دیا۔

سنتوش ٹرافی میں پنجاب کو ایسی ہی نمایاں کامیابی ۱۹۷۴ء میں پھر حاصل ہوئی، جب اس نے فائنل میں بنگال کی مضبوط ٹیم کو صفر کے مقابلے میں چھ گولوں سے ہرایا۔ ۱۹۷۳ء میں یہ ٹورنامنٹ کیرالا نے جیتا۔ ۱۹۷۵ء میں جیت بنگال کی ہوئی۔

ان خاص مقابلوں کے علاوہ ہندوستان کی ہر ریاست میں میرے لیے چھوٹے بڑے کتنے ہی سارے اور مقابلے بھی ہوتے ہیں۔ ان میں ڈُراون کورکپ، شیفورڈ کپ (بنگلور) پریذی ڈینسی کپ (مدراس)، راجہ منڈری گولڈ کپ، دیانند بندودکر گولڈ ٹرافی فٹ بال ٹورنامنٹ، تندکرنی کپ، سروسز فٹ بال چمپین شپ، آل انڈیا سول سروسز چمپین شپ اور ڈی۔سی۔ایم ٹورنامنٹ وغیرہ شامل ہیں۔ بعض بڑے شہروں میں لیگ کے مقابلے بھی برابر اور باقاعدہ کھیلے جاتے ہیں مثلاً بمبئی میں کھیلا جانے والا مقابلہ ہارورڈ لیگ — لیکن ایسے کسی لیگ کی اہمیت کلکتہ کی سینئر ڈویژن لیگ جیسی نہیں ہاں، دہلی میں کھیلے جانے والے ڈی۔سی۔ایم ٹورنامنٹ میں چار بار ایران کی ٹیم تاج کلب شریک ہوئی ہے۔ وہ تین بار یہ ٹورنامنٹ جیت چکی ہے

۱۹۷۲ء میں اس ٹورنامنٹ میں تین غیر ملکی ٹیمیں شریک ہوئی تھیں۔ ایک تاج تھی، دوسری دو ٹیمیں مغربی جرمنی اور شمالی کوریا کی تھیں۔ یہ ٹورنامنٹ شمالی کوریا کی ٹیم اپریل ۲۵ کلب نے جیتا تھا۔

۱۹۷۴ء میں بھی دو غیر ملکی ٹیمیں اس ٹورنامنٹ میں شامل ہوئی تھیں۔ ایک ٹیم جنوبی کوریا کی تھی اور دوسری پورٹ اتھارٹی بنکاک کی۔ لیکن اب کے بار یہ ٹورنامنٹ ایسٹ بنگال نے جیتا۔ فائنل میں اُس نے پنجاب پولیس کو ہرایا۔

اِدھر اس ٹورنامنٹ کی مقبولیت آئے دن بڑھتی جا رہی ہے

بڑوں کے مقابلوں کے علاوہ میرے کچھ مقابلے تم جیسے لڑکوں کے لیے بھی ہوتے ہیں۔ ان میں سے سبراتو کپ ٹورنامنٹ اور جونیئر نیشنل چمپین شپ ٹورنامنٹ خاص طور پر ذکر کے قابل ہیں۔ پہلے ٹورنامنٹ میں مختلف ریاستوں کے



فوجی اور غیر فوجی اسکولوں کی ٹیمیں حصہ لیتی ہیں ۔ سبرا تو کپ ٹورنامنٹ دہلی میں ڈیورنڈ سے پہلے کھیلا جاتا تھا۔ اس لیے اُسے "چھوٹا ڈیورنڈ" بھی کہتے ہیں۔ اس میں ڈیرادون کی گورکھا بوائز کمپنی، گورکھا ملٹری اسکول کی ٹیمیں، ناگالینڈ اور کار نکوبار کی ٹیمیں چھائی رہتی ہیں، جونیر نیشنل چیمپین شپ ٹورنامنٹ میں ریاستوں کی ٹیمیں شامل ہوتی ہیں۔ اس کو چھوٹا سنتوش ٹرافی ٹورنامنٹ کہنا مناسب ہوگا۔ یہ ہر سال کسی مختلف شہر میں کھیلا جاتا ہے۔ پھر اسکولوں، کالجوں، یونی ورسٹیوں کے اپنے الگ الگ اور ان کے درمیان ٹورنامنٹ بھی ہوتے ہیں۔

ملک میں بعض ٹورنامنٹ ایسے بھی کھیلے جاتے ہیں، جو میرے دوسرے مقابلوں سے بالکل الگ ہیں۔ سچ مچ بڑے دلچسپ ہیں وہ۔ اور اُن کا بھی ایک مقصد ہے۔

ایسے ٹورنامنٹوں کے بارے میں بتاؤں؟ تو سنو —

ایسے دو ٹورنامنٹ حیدرآباد میں کھیلے جاتے ہیں۔ پہلا ایک دن کا ٹورنامنٹ ہے۔ یہ ۱۹۵۰ء سے کھیلا جا رہا ہے — یہ ٹورنامنٹ فٹ بال میلہ کہلاتا ہے۔ دیکھا میرے میچ ہوتے ہیں اور میلے بھی۔ خیر، یہ ہر برس آزادی کے دن یعنی ۱۵ اگست کو کھیلا جاتا ہے۔ یہ دن میں اڑھائی بجے شروع ہو کر ساڑھے چار گھنٹے میں ختم ہو جاتا ہے۔ اس میں ہر میچ دس منٹ کا ہوتا ہے۔ درمیان میں کوئی وقفہ نہیں ہوتا۔ اگر کوئی بھی ٹیم گول نہ کر پائے۔ تو اس وقت تک اور وقت دیا جاتا ہے جب تک کہ کوئی ٹیم گول نہ کرے۔ یا اُسے کارنر کِک نہ مل جائے۔ یہ مقامی ٹورنامنٹ ہے۔ اس کا مقصد میرے کھلاڑیوں کو تیز رفتار کھیل کا ڈھب سکھانا ہے۔

دوسرا "نان ڈرب لنگ" ٹورنامنٹ ہے۔ یہ ۱۹۵۱ء میں شروع کیا گیا تھا۔ اس ٹورنامنٹ کا مقصد بھی میرے کھلاڑیوں کو تدبیریں کرنا، لمبے اور چھوٹے پاس کھیلنا، مجھے فوراً دوسرے کھلاڑی کو پھینکنا، پوزیشن پر کھیلنا وغیرہ سکھانا ہے۔ کچھ کھلاڑی مجھے بلا ضرورت اپنے ساتھ رکھتے اور پیروں میں گھسیٹتے پھرتے ہیں۔ اس ٹورنامنٹ کا مقصد اس خرابی کو بھی ختم یا کم کرنا ہے۔ اس میں میرے کھیل کے سارے قاعدے طریقے استعمال کئے جاتے ہیں۔

میں نے سُنا ہے کلکتہ میں بھی ایک عجیب شیلڈ ٹورنامنٹ کھیلا جاتا ہے۔ اس میں کھلاڑی مجھ سے نہیں میرے چھوٹے بھائی یعنی ٹینس کے گیند سے کھیلتے ہیں۔ اس کا مقصد بھی میرے کھلاڑیوں کو یہ سمجھانا ہوتا ہے کہ انہیں مجھ سے کیسے پیش آنا چاہیے اور مجھے کیسے ہوشیاری کے ساتھ اپنے اختیار میں رکھنا چاہیے۔

تو یہ تھا ہندوستان کے بڑے بڑے ٹورنامنٹوں کا ذکر۔ ہاں۔ یہ کچھ تفصیلی رہا۔ لیکن اس کا ایک فائدہ بھی ہوا یعنی میری اچھی ٹیموں، ان کے کھیل اور اچھے مقابلوں کے بارے میں بھی تمہیں بہت سی باتوں کا پتہ چل گیا۔ میری بعض دوسری اچھی ٹیمیں ٹاٹا اسپورٹس کلب، بی این ریلوے، ویسٹرن ریلوے اور ڈیمپو، واسکو، سول گاؤن کر وغیرہ ہیں۔

اب میں تمہیں کچھ باتیں باہری ملکوں میں، اولمپک کھیلوں اور ایشیائی مقابلوں میں ہندوستانی ٹیم کے کھیل اور اُن کی کامیابیوں کے بارے میں بتاؤں گا۔

میں بدیس گیا

ہندوستان کے بڑے فٹ بال ٹورنامنٹوں کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں۔ تمہیں بتا چکا ہوں کہ اب غیر ملکی ٹیمیں بھی میرے اِن مقابلوں میں حصّہ لینے لگی ہیں۔ وجہ؟ ان مقابلوں کو میرے اچھے کھیل کا نمونہ سمجھا جانے لگا ہے۔ اس کا مطلب ہوا: میرے ہندوستانی کھلاڑی میرے کھیل کا اچھا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ ہاں اُن کا کھیل باہری ملکوں میں بھی سراہا جاتا ہے۔ وہ ملک سے باہر کئی مقابلوں میں کھیل چکے ہیں۔ وہ اب بھی کھیلتے ہیں۔

اولمپک کھیلوں کی مثال لو۔ میری ہندوستانی ٹیم ۱۹۴۸ء میں پہلی بار اولمپک کھیلوں میں شامل ہوئی تھی۔ اس برس یہ کھیل انگلستان کی راجدھانی لندن میں ہوئے تھے۔ اگرچہ اِن کھیلوں میں ہندوستانی ٹیم کو پہلے ہی میچ میں ہار ہوئی تھی۔ لیکن اُس نے بہت اچھا کھیل دکھایا تھا۔ اُس کی ہار خراب کھیل کی وجہ سے نہیں ہوئی تھی۔ اسے قسمت کہو یا کچھ اور۔ ہندوستان نے دو پنلٹی گیں گنوائیں۔ نتیجہ ظاہر ہے! اور ہو بھی کیا سکتا تھا۔ لیکن اگلے اولمپک

کھیلوں میں ہندوستانی ٹیم کو منہ کی کھانی پڑی۔ ۱۹۵۲ء میں یہ کھیل ہیل سنکی میں ہوئے تھے۔ پہلا مقابلہ یوگوسلاویہ کی مضبوط ٹیم سے پڑا۔ یوگوسلاویہ نے اس میچ میں دس گول کیے جبکہ ہندوستانی ٹیم صرف ایک گول اُتار پائی۔ یہ گول احمد خاں نے کیا تھا۔ ۱۹۵۶ء میں ملبورن میں ہوئے اولمپک کھیلوں میں ہندوستانی ٹیم کا مقابلہ ایک بار پھر یوگوسلاویہ سے پڑا۔ لیکن اس بار نتیجہ پچھلے مقابلے جیسا خراب نہیں رہا۔ ہندوستانی ٹیم ہاری تو لیکن صرف تین گولوں سے۔ یوگوسلاویہ کی ٹیم نے چار گول کیے، جبکہ ہندوستانی ٹیم صرف ایک گول کر پائی۔ لیکن ایک بات اپنی جگہ اہم ہے۔ میچ کا پہلا گول ہندوستانی ٹیم نے کیا تھا۔ اِن کھیلوں میں ہندوستانی ٹیم چوتھے نمبر پر آئی تھی۔

خیر— یہ تو میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ اولمپک کھیل جیتنے والی ٹیم ضروری نہیں کہ دُنیا کی سب سے اچھی ٹیم ہو۔ اس لیے کہ اولمپک کھیل صرف شوقیہ کھلاڑیوں کے لیے ہوتے ہیں۔ ایسے میں تمہارے لیے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ دُنیا کی دُوسری بڑی ٹیموں کے مقابلے میں میرے ہندوستانی کھلاڑیوں کے کھیل کا معیار کیسا ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے: وہ ان ٹیموں اور کھلاڑیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے— ایسی کئی مثالیں ہمیں ماضی میں دیکھنے کو ملی ہیں۔ مثلاً پچھلے برسوں میں سویڈن، آسٹریلیا، جرمنی، اور رُوس کی جو ٹیمیں ہندوستان کے دورے پر آئیں وہ اپنی جگہ دُنیا کی بہت اچھی ٹیمیں نہیں تھیں، لیکن کھیل کا بہت اچھا معیار رکھتی تھیں۔ ان ٹیموں نے ہندوستان کے چنے ہوئے کھلاڑیوں سے بنی ٹیموں سے جتنے بھی میچ کھیلے، کئی کئی گولوں سے جیتے۔ اور ہمیں معلوم ہو گیا کہ ہندوستانی کھلاڑی اِن غیر ملکی کھلاڑیوں کی رفتار، کھیل کے انداز، کھیل کی سمجھ بوجھ، موقع سے فائدہ اٹھانے اور گول کرنے کی صلاحیت کا کوئی جواب نہیں رکھتے۔

لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میرے ہندوستانی کھلاڑیوں کا کھیل کچھ ہے ہی نہیں۔ مثال ماضی سے لیں۔ ماضی میں چین، برما، سیلون اور پاکستان کی جو ٹیمیں ہندوستان آئیں۔ ان کے مقابلے میں میرے ہندوستانی کھلاڑیوں کا کھیل بہت اچھا رہا۔ انہوں نے کئی سارے مقابلے جیتے۔ یہ بات بہت دنوں پہلے کی نہیں۔ ایک عالمی ٹیم ڈس ٹورین ڈو ہندوستان آئی تھی۔ اس ٹیم میں دُنیا کے کئی سارے ملکوں کے چُنے ہوئے کھلاڑی شامل تھے۔ اس ٹیم نے دہلی میں جو میچ راشٹرپتی کی ٹیم سے کھیلا تھا، اس میں اُسے ہار ہوئی تھی۔

میرے اچھے ہندوستانی کھلاڑیوں کی ملک سے باہر بھی بڑی عزت ہے۔ مثلاً ماضی قریب میں میرے کھلاڑی اندر سنگھ کو ملائشیا آنے اور ایک نمائشی مقابلے میں کھیلنے کی دعوت دی گئی تھی۔ اندر سنگھ جالندھر کے لیڈرز کلب کا کھلاڑی تھا۔ اس کا شمار ملک کے بہترین سنٹر فارورڈ کھلاڑیوں میں ہوتا ہے۔ اس نمائشی میچ میں اندر سنگھ ٹنکو عبدالرحمٰن کی ٹیم کی طرف سے کھیلا تھا۔ بچو، جانتے ہو نا، ٹنکو عبدالرحمٰن کون ہے؟ ٹنکو عبدالرحمٰن میرے اچھے کھیل اور میرے اچھے کھلاڑیوں کا بڑا قدر دان ہے۔ وہ ملائشیا کا وزیرِ اعظم تھا۔

تو خیر— دُنیا کے بڑے مقابلوں میں نہ سہی، لیکن ایشیائی ملکوں اور مقابلوں میں ہندوستان اپنی ایک جگہ رکھتا ہے

اور پھر ان ملکوں اور مقابلوں سے اُس کا تعلق نیا نہیں۔ اس کی بھی ایک کہانی ہے۔ سنو۔

یہ بات ۱۹۲۴ء کی ہے۔ ہندوستان میں مجھے اور میرے کھلاڑیوں کو ایک مقام مل چکا تھا اور اب اُن کی آنکھیں باہری ملکوں کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ اسی برس ایک ہندوستانی ٹیم ملک سے باہر دوستانہ میچ کھیلنے گئی تھی۔ اس سے میرے ہندوستانی کھلاڑیوں کے حوصلے بڑھے تھے۔ پھر وہ ۱۹۲۵ء ۱۹۲۶ء اور ۱۹۲۷ء میں دوسرے ملکوں کے دوروں پر گئے تھے۔ اب کے انہیں پہلے جیسی کامیابی نہ ملی۔ لیکن ایک بات ثابت ہوگئی، یہ کہ میرے ہندوستانی کھلاڑی جنوب مشرقی ایشیا کے ملکوں کے کھلاڑیوں سے کسی طرح کم نہیں تھے۔ نہ ہنرمندی میں اور نہ مہارت میں۔ یہ دوستانہ مقابلے غیر رسمی تھے۔ لیکن اُن کا بھی ایک فائدہ ہوا۔ ہندوستان میں میرے کھیل کی سب سے پہلی نگراں جماعت انڈین فٹ بال ایسوسی ایشن کو ہندوستانی ٹیمیں باہر بھیجنے کا خیال پیدا ہوا۔ ایسی پہلی ٹیم ۱۹۲۳ء میں بھیجی گئی تھی۔ یہ سیلون گئی تھی۔ دوسری ۱۹۲۴ء میں جنوبی افریقہ اور تیسری ۱۹۳۸ء میں آسٹریلیا گئی تھی۔

ان دونوں ہندوستانی کھلاڑیوں کی ایک خاص بات اور بھی تھی۔ وہ ننگے پاؤں کھیلا کرتے تھے۔ جاوا اور آسٹریلیا میں جن کھلاڑیوں نے اپنا بہترین کھیل دکھایا، وہ ننگے پیر ہی کھیلے تھے۔ سچ پوچھو تو ۱۹۲۴ء سے ۱۹۳۸ء تک کا زمانہ ہی میرے ننگے پیر کھیل کا بہترین زمانہ ہے۔ جاوا میں میرے ہندوستانی کھلاڑی صمد کی جادوگری رزبی گنگولی کی بارہ سنگھے جیسی تیز دوڑ، سیلون کے میدان میں گوسٹھو پال کے چٹان جیسے دفاع، مجید کی تیز تحریکوں، کاشی نارائن کی بے جھجک کِکوں اور آسٹریلیا میں پرساد کی سبک پائی نیز رحیم کی بے مثال ہنرمندی نے ان ملکوں میں میرے کھلاڑیوں اور تماشائیوں کو حیرت میں ڈال دیا تھا۔ ان ملکوں میں میرے ان کھلاڑیوں کو "برقی لڑکے" "جادوگر" "بیر پنجہ گیند کے دھوکے باز" تک کہا گیا۔ ان کھلاڑیوں کی یہ کامیابی شاید ننگے پاؤں کھیلنے کا نتیجہ تھی لیکن بعد میں پیٹر مارٹزبرگ کے کانچ سے اٹے اور ملبورن کے کالی مٹی سے بنے پتھر جیسے سخت میدانوں اور کیپ ٹاؤن کی ہاتھ پاؤں سُن کر دینے والی سردی میں ہندوستانی کھلاڑیوں کو بڑی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا۔ انہیں معلوم ہوگیا کہ میدان اور موسم کی ایسی حالت میں دُنیا کے بڑے مقابلوں میں ننگے پاؤں کھیلنا ممکن نہیں۔ پھر بھی وہ ۱۹۵۲ء تک اُن مقابلوں میں ننگے پاؤں ہی کھیلتے رہے۔

میں بتا چکا ہوں: ہندوستان ایشیا میں میرے مقابلوں میں اپنا ایک مقام رکھتا ہے۔ اس کا ایک سیدھا سا ثبوت یہ ہے کہ اس نے کئی ایشیائی مقابلے جیتے ہیں۔ مثلاً پہلے ایشیائی کھیلوں میں میرا مقابلہ ہندوستان نے جیتا تھا۔ یہ کھیل ۱۹۵۱ء میں نئی دہلی میں ہوئے تھے۔ سیمی فائنل میں ہندوستان کا مقابلہ افغانستان سے پڑا۔ ہندوستان نے یہ میچ تین گولوں سے جیتا۔ یہ گول وینکیش، میوہ لال اور نندی نے کئے جبکہ فائنل میں ایرانی ٹیم کے خلاف کھیلتے ہوئے گول کرنے میں کامیابی صرف میوہ لال کو ہوئی۔ ہوا یوں کہ گوہا ٹھکرانے میوہ لال کو قدرے اُونچا پاس دیا۔ میوہ لال نے موقع پاتے ہی مجھے اپنے پیروں میں لیا اور ۲۵ گز کے فاصلے سے کِک لگائی۔ ایرانی گول کیپر آغا حسینی نے لپک کر ہاتھ ہوا میں پھیلائے۔ لیکن میں گول میں جا چکا تھا۔ ہندوستانی ٹیم جیت گئی تھی۔ ہندوستانی ٹیم نے اپنے بہت اچھے کھیل کا ثبوت دیا تھا۔

لیکن ایسا بھی نہیں کہ ایشیائی ملکوں میں سب سے اچھا کھیل میرے ہندوستانی کھلاڑیوں کا ہے۔ دوسرے اور بعد کے ایشیائی کھیل اس بات کی اچھی مثال ہیں۔ دوسرے ایشیائی کھیلوں میں تو ہندوستانی ٹیم پہلے ہی میچ میں ہار گئی تھی۔ انڈونیشیا کی ٹیم نے اپنی پچھلی ہار کا بدلا چکا لیا تھا — ہندوستانی اچھے کھیل کے باوجود گول نہ کر پائے تھے۔ اس پر میرے کھیل کے ایک اچھے پارکھ نے کہا تھا: "ہندوستانی کھلاڑیوں کو جوتے پہن کر کھیلنے کا ہنر ابھی سیکھنا ہے۔" اور پچھلے برسوں میں ہندوستانی کھلاڑیوں نے یہ ہنر خوب سیکھا ہے۔ اس کا ثبوت وہ کامیابی ہے جو انہیں ۱۹۷۰ء میں بنکاک میں ہوئے، چھٹے ایشیائی کھیلوں میں حاصل ہوئی۔ اس مقابلے میں اس نے برونز کا تمغہ جیتا تھا۔ ہندوستانی ٹیم سیمی فائنل میں برما کی بڑی مضبوط ٹیم سے ہاری۔ فائنل برما ہی نے جیتا تھا۔ تیسری جگہ کے مقابلے میں ہندوستانی ٹیم نے جاپان کو ہرایا۔ ہندوستانی ٹیم کے لیے گول اِن سائڈ لفٹ منجیت نے کیا تھا۔ اس سے پہلے یعنی انڈونیشیا اور جنوبی ویٹ نام کی ٹیموں سے ہوئے مقابلوں میں بھی ہندوستانی ٹیم نے بہت اچھا کھیل دکھایا۔ انڈونیشیا سے کھیلتے ہوئے ہندوستانی کھلاڑیوں نٹ راج، شام تھاپا اور مگن سنگھ نے آخری دس منٹ کے اندر تین گول کئے۔ اسی طرح جنوبی ویٹ نام کے ساتھ کھیلتے ہوئے کھیل کے دوسرے حصے میں حبیب اور منجیت نے گول کر کے سب کو حیرت میں ڈال دیا تھا۔

اس سے پہلے کہ میں ایک اور اہم ایشیائی ٹورنامنٹ — مرڈیکا فیسٹول ٹورنامنٹ کا ذکر کروں، اچھا ہوگا اگر ایشیائی قواڈرینگلر کے بارے میں تمہیں کچھ بتا دوں۔ یہ ٹورنامنٹ ۱۹۵۲ء میں سیلون فٹ بال ایسوسی ایشن نے کولمبو پلان کی نمائش کے موقع پر شروع کیا تھا۔ یہ کُل چار بار کھیلا گیا۔ اس میں ہندوستان، سیلون، پاکستان اور برما شریک ہوا کرتے تھے۔ کولمبو میں کھیلے گئے پہلے قواڈرینگلر میں پاکستان اور ہندوستان ساجھے چیمپئن قرار پائے تھے۔ ہندوستان نے ابتدائی مقابلوں میں سیلون کی ٹیم کو تین اور برما کی ٹیم کو چار گولوں سے ہرایا تھا۔ ۱۹۵۳ء میں دوسرا قواڈرینگلر رنگون میں کھیلا گیا تھا۔ اس میں ہندوستان کو پچھلے برس کی نسبت زیادہ کامیابی حاصل ہوئی۔ یعنی اس نے سیلون کو دو، برما کو دو کے مقابلے میں چار اور فائنل میں پاکستان کو ایک گول سے ہرا کر ٹورنامنٹ جیتا تھا۔

تیسرا قواڈرینگلر کلکتہ میں کھیلا گیا تھا۔ اس میں ہندوستان کی بہترین ٹیم شریک ہوئی تھی۔ اس ٹیم کا کپتان موہن بگان کا منجھا ہوا کھلاڑی سیلن منا تھا۔ عجیب اتفاق ہے، ہندوستان کی ٹیم نے اپنے بے حد اچھے کھلاڑیوں

کے باوجود سیلون کی ٹیم کے ساتھ اپنا پہلا ہی میچ برابر کھیلا۔ نور نے ہندوستان کے لیے ایک گول کیا، جسے آخری منٹ میں سیلونی ٹیم کے فرنینڈو نے اُتار دیا۔ دوسرے مقابلے میں ہندوستان نے برما کو ایک کے مقابلے میں دو گولوں سے ہرایا۔ یہ گول پورن بہادر اور معین نے کئے۔ فائنل ایک بار پھر ہندوستان اور پاکستان کے درمیان پڑا۔ ہندوستانی ٹیم نے فائنل میں تین گول کئے جبکہ اس کے خلاف ایک ہی گول ہو پایا۔ ہندوستانی ٹیم کے لیے تینوں گول ان سائڈ لفٹ پورن بہادر نے کئے تھے۔

۱۹۵۵ء میں ڈھاکہ میں ہوئے چوتھے قواڈرینگلر میں کھیل کا عام معیار بہت اچھا رہا۔ سیلون کی ٹیم نے اپنے اچھے کھیل سے ہندوستان اور پاکستان کی ٹیموں کو امتحان میں ڈالے رکھا۔ اس نے تین گول کئے۔ لیکن ہندوستانی کھلاڑیوں کا تجربہ کام آیا۔ انہوں نے جواب میں چار گول کئے یہ گول پی کے بینرجی، میوہ لال اور ستار نے کئے تھے۔ فائنل چوتھی بار بھی پاکستان اور ہندوستان کے درمیان پڑا۔ جیت ہندوستانی ٹیم کی ہوئی۔ اس نے یہ مقابلہ تین گولوں سے جیتا تھا

یہ قواڈرینگلر ٹورنامنٹ بہت مقبول ہوا تھا اور شاید اسی لیے اس کا انتظام کرنے والوں نے اس کا ہر برس کھیلا جانا طے کیا تھا۔ لیکن یہ ۱۹۵۵ء کے بعد سے نہیں کھیلا گیا۔

اب آخر میں تمہیں ایک اور اہم ایشیائی مقابلے کے بارے میں بتانے جا رہا ہوں۔ یہ مرڈیکا فیسٹول ٹورنامنٹ ہے۔ یہ ہر برس ملائشیا کی راجدھانی کوالالمپور میں کھیلا جاتا ہے۔

۱۹۷۰ء میں ۱۳ ویں مرڈیکا فیسٹول میں ہندوستان اپنے گروپ میں دوسرے نمبر پر اور سارے ٹورنامنٹ میں تیسرے نمبر پر آیا۔ سیمی فائنل میں ہندوستانی ٹیم کوریا سے ہاری۔

۱۹۷۰ء میں مرڈیکا چیمپین کوریا ہی کی ٹیم رہی تھی۔ لیکن اس میچ میں بھی پہلے دو گول میرے ہندوستانی کھلاڑیوں نے کئے۔ بعد میں کوریا کی ٹیم نے تین گول کئے۔ اور اگر مگن سنگھ نے ایک پنلٹی لگ اور یقینی گول کا ایک موقع نہ گنوایا ہوتا تو شاید کھیل کی صورت کچھ دوسری ہوتی۔ خیر —

تیسری جگہ کے مقابلے کے لیے ہندوستانی ٹیم نے ہانگ کانگ کی ٹیم کے ساتھ وہی کچھ کیا جو سیمی فائنل میں کوریا نے اس کے ساتھ کیا تھا۔ ہانگ کانگ کی ٹیم دو گول کر چکی تھی۔ لیکن ہندوستانی کھلاڑی بے دل نہ ہوئے تھے۔ انہوں نے بڑھ چڑھ کر تحریکیں کیں۔ نتیجہ اچھا نکلا۔ ہانگ کانگ کے بیک کھلاڑی حملوں کی تاب نہ لا سکے۔ ان کی صفیں بار بار ٹوٹیں۔ ایسے میں دو گول مگن سنگھ نے اور ایک گول حبیب نے کیا اور اس طرح تیسری جگہ کے لیئے کھیلا گیا یہ مقابلہ جیت لیا۔

۱۹۷۱ء میں یہ ٹورنامنٹ برما نے، ۱۹۷۲ء میں جنوبی کوریا نے اور ۱۹۷۳ء اور ۱۹۷۴ء میں ملائشیا نے جیتا تھا۔ ادھر گزشتہ عرصہ میں ہندوستان اس ٹورنامنٹ میں کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہیں کر سکا۔

البتہ ۱۹۷۱ء میں ایک اہم ایشیائی ٹورنامنٹ سنگاپور میں ہوا تھا۔ اس پیسٹا سوکن فٹ بال ٹورنامنٹ میں ہندوستان اور جنوبی کوریا سانجھے چیمپین قرار پائے تھے۔

بچو: اس سے تمہیں اندازہ ہو گیا ہوگا کہ دُنیا میں نہیں تو کم سے کم ایشیا میں میرے ہندوستانی کھلاڑی کوئی حیثیت رکھتے ہیں۔ اُن کا نام ہے۔ ایک مقام ہے



روپیہ، عزّت، شہرت

اوپر:
مارٹن پیٹرز
درمیان میں، دائیں سے:
جارج بیسٹ
بوبی مور
پیلے
نیچے، دائیں سے:
گرڈ مولر
بیکن بائر



ہاں ۔ مجھے یاد ہے ۔ میں نے تم سے ایک وعدہ کیا تھا۔ اپنے بڑے اور مشہور کھلاڑیوں کے بارے میں کچھ باتیں بتانے کا۔ لیکن پہلے تم میرے ایک سوال کا جواب دو ۔ بتاؤ تو آدمی عام طور کیا چاہتا ہے ؟

"روپیہ، پیسہ"

"عزت، اعزاز"

"شہرت، مقبولیت"

ٹھیک کہا۔ لیکن کیا تم جانتے ہو: میرے کھلاڑی میری وجہ سے روپیہ پیسہ عزت، اعزاز، شہرت مقبولیت سبھی کچھ پاتے ہیں۔

روپیہ پیسہ کی بات پہلے لیں۔ میرا کھیل آج ایک پیشہ بن گیا ہے۔ ایسا آج نہیں ہوا ۔ انگلستان میں اسے قانونی طور پر ۱۸۸۵ء میں مان لیا گیا تھا۔ میرے اچھے اور بڑے کلب میرے اچھے کھلاڑیوں کو بڑی بڑی تنخواہیں دیتے ہیں۔ تنخواہوں کے علاوہ انہیں ہنرمندی کا انعام بھی ملتا ہے۔ جانتے ہو نا۔ انعام کب اور کیوں ملتا ہے ؟ ہاں ۔ یہ جبھی ملتا ہے: جب کوئی سچ مچ بڑا کام کرتا ہے۔ میرے کلب میرے کھلاڑیوں کو لیگ یا ٹورنامنٹ جیتنے پر انعام دیتے ہیں۔

کرف

میرے پیشہ ور کھلاڑی ایک قاعدے کے پابند ہوتے ہیں۔ ایسے ہر کھلاڑی کو اپنے کلب کے ساتھ ایک "ٹھیکہ" کرنا پڑتا ہے اس ٹھیکہ کی مدت مقرر ہوتی ہے ۔ اس مدت میں وہ کسی دوسرے کلب کے لیے نہیں کھیل سکتا۔ لیکن ایسا ہو سکتا ہے کہ کوئی کلب کسی کھلاڑی کو خرید لے ۔

"خرید لے ؟"

ہاں، میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ خریدنے سے میرا مطلب ہے کہ کوئی کلب مانگی گئی رقم دے کر اپنے مرضی کے کھلاڑی کا تبادلہ اپنے کلب میں کرالے۔ اس طرح دی گئی رقم کو "تبادلے کی اُجرت" کہتے ہیں۔ ایسی اجرت پہلی بار انگلستان میں ۱۹۰۵ء میں دی گئی تھی۔ آج کل ایک کھلاڑی کے تبادلے کے لیے ایک لاکھ پونڈ کی اُجرت بہت معمولی سمجھی جاتی ہے ۔ اور بعض کھلاڑی بیش قیمت سمجھے جاتے ہیں۔ مثلاً گگ یباری کے کھلاڑی لوئی گی ریوا کا تبادلہ کسی بھی قیمت پر مناسب خیال نہیں کیا جاتا۔

اور تنخواہ —— ! یہ میں پہلے بتا چکا ہوں: کلب پیشہ ور کھلاڑیوں کو باقاعدہ تنخواہ دیتے ہیں۔ یہ کھلاڑی کے کھیل کے مطابق ہوتی ہے ۔ برازیل کے کھلاڑی پیلے کو اپنے کلب سنٹوس سے بارہ ہزار چھ سو ڈالر ہر مہینے ملتے تھے۔ لیکن یہ اس کی آمدنی کا صرف ایک حصہ تھا۔ نمائشی میچ کھیلنے کے اُسے بڑے پیسے ملتے تھے۔ ہاں اب تو پیشہ ور کھلاڑیوں نے اپنی انجمنیں بنالی ہیں، جو ان کے فائدے کا خیال رکھتی ہیں۔

انعام —— تنخواہ کے علاوہ میرے کھلاڑیوں کو ہنرمندی کا انعام بھی دیا جاتا ہے۔ انعام کی صورت بھی عجیب رہتی ہے۔ یہ جنس اور نقدی دونوں میں ہو سکتا ہے۔ اچھا کھیلنے کا انعام اچھی اور پکّی نوکری بھی ہو سکتی ہے مثلاً ۱۹۷۰ء کا ورلڈ کپ ٹورنامنٹ جیتنے والی برازیلی ٹیم کے ہر کھلاڑی کو بھاری نقد انعام کے ساتھ ایک ایک کار ملی تھی اور ایک ایک مکان ۔ اور ہر کھلاڑی کو پکّی نوکری بھی پیش کی گئی تھی۔ دیکھا کیسے کیسے انعام ملتے ہیں، میرے کھلاڑیوں کو ! ہر دوسرے شخص کی طرح میرے کھلاڑی کو بھی اپنی آمدنی پر سرکار کو ٹیکس دینا ہوتا ہے۔ لیکن میرے کھیل کے انعام کو ٹیکس سے بری بھی کر دیا جاتا ہے۔ ابھی برازیلی کھلاڑیوں کے انعام کی بات چل رہی تھی۔ ان کھلاڑیوں نے برازیل کے صدر سے شکایت کی کہ ان کو انعام کی رقم آمدنی ٹیکس کے محکمے نے ٹیکس کاٹنے کے بعد دی ہے ۔ اس پر برازیل کے صدر نے انعام کی رقم کو ٹیکس سے بری کر دیا۔ اور حکم دیا کہ کاٹی گئی رقمیں کھلاڑیوں کو واپس کر دی جائیں۔

یہ تو ہوئی روپے پیسے کی بات اور عزّت و اعزاز! میرے کھلاڑیوں کا بڑا مان دان ہوتا ہے۔ ارجن ایوارڈ کے بارے میں تو تم نے سُن ہی رکھا ہوگا۔ ہندوستان کی سرکار ہر سال یہ اعزاز اُن کھلاڑیوں کو دیتی ہے، جو اپنے اپنے میدان میں بہترین کھیل کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔

۱۹۷۰ء میں علاوہ دوسرے کھلاڑیوں کے یہ اعزاز میرے کھلاڑی اندر سنگھ کو بھی دیا گیا تھا۔ میرے کھلاڑیوں کو ایسا ہی مان دان دُنیا کی دوسری حکومتیں بھی دیتی ہیں۔ میرے کھلاڑی پیلے کو برازیل کا سب سے بڑا قومی اعزاز ہی نہیں فرانس اور یوگوسلاویہ کے اعزاز بھی مل چکے ہیں۔

اچھا ہوا کہ پیلے کا ذکر پھر آگیا۔ پیلے کے بارے میں

کچھ باتیں میں تمہیں خاص طور پر بتانا چاہتا تھا۔ اس لیے کہ پیلے سے بڑا ہیرا کھلاڑی آج تک پیدا نہیں ہوا۔ اس کی بڑائی کا اندازہ تم یوں کر سکتے ہو — وہ اپنی زندگی ہی میں ایک کہانی بن گیا ہے۔ اُس کی کئی کہانیاں چل پڑی ہیں۔ اُسے "کالا ہیرا" "فٹ بال بادشاہ" اور نہ جانے کیا کیا کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ لوگ اطالوی کھلاڑی لوئی گی ریوا کو ۵، لاکھ روپے کی ٹانگوں والا کھلاڑی کہتے ہیں۔ لیکن مجھے یہ بات پیلے کے لئے زیادہ سچی معلوم ہوتی ہے۔

پیلے ہی میرا ایک ایسا کھلاڑی ہے، جو چار بار ورلڈ کپ ٹورنامنٹ میں کھیل چکا ہے اور پیلے ہی دُنیا کا ایک اکیلا کھلاڑی ہے جو اس کپ کو تین بار جیتنے والی ٹیم میں شامل رہا ہے۔ جب وہ پہلی بار اس ٹیم میں کھیلا تو کُل سترہ برس کا تھا۔ یہ بات ۱۹۵۸ء کی ہے۔ پیلے کی دھاک کپ کے فائنل میں کئے ایک ہی گول سے جم گئی تھی۔ ہاں، میں تمہیں بتاؤں گا کہ پیلے نے یہ گول کیسے کیا تھا۔ اور یہ بھی بتاؤں گا کہ آج دُنیا میں کون کون سے کھلاڑی ایسے ہیں جو گول کرنے میں اپنا جواب نہیں رکھتے اور جنہیں اطالوی محاورے کے مطابق گول ایجاد کرنے والے کھلاڑی کہا جاتا ہے۔

ایک دلچسپ بات یاد آگئی۔ پیلے ہی کے بارے میں ہے۔ ہاں ذرا حیرانی میں ڈالنے والی ہے — سنو، تمہارے پاس ایک بہت قیمتی چیز ہے۔ بے حد قیمتی! — بھلا بتاؤ تو کیا تم وہ چیز کسی دوسرے کو دینا پسند کرو گے! شاید نہیں۔ لیکن دے بھی سکتے ہو۔ اس لیے کہ وہ تمہاری اپنی ہے۔ اور اگر ایسی کوئی چیز گھر بھر کی ساجھی ہو تو وہ تم نہیں دے پاؤ گے۔ اس لیے کہ وہ چیز گھر کے دوسروں کے لیے بھی قیمتی ہو گی۔ اور یہ کہ وہ اس چیز کو کسی قیمت پر نہیں دینا چاہیں گے۔ گھر کا ایک قاعدہ ہوتا ہے۔ ایسا ہی قاعدہ قانون ہر ملک کا ہوتا ہے۔ ہر قیمتی شے قومی ملکیت سمجھی جاتی ہے۔ اس کی حفاظت قومی جائیداد کے قانون سے کی جاتی ہے۔ اس کے مطابق ملک اور قوم کی قیمتی شے کو ملک سے باہر نہیں لے جایا جا سکتا۔ یہ قانون عام طور پر علم اور فن کے بہت قیمتی نمونوں پر لاگو کیا جاتا ہے۔

بھئی اتنی بے صبری بھی کیا! شاید تم سمجھ رہے ہو، میں پیلے کی بات بھول کر قانون کی بات لے بیٹھا ہوں۔ نہیں ایسا نہیں ہے۔ اور اسی میں حیرانی کی بات ہے۔ یعنی برازیل میں یہ قانون میرے کھلاڑی پیلے پر بھی لاگو ہوتا تھا۔ سمجھے۔ کتنا قیمتی تھا وہ اپنے ملک کے لیے! تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ پیلے برازیل سے باہر کسی دوسرے ملک یا کلب کے لیے کسی بھی قیمت پر نہیں کھیل سکتا تھا۔

یہی نہیں پیلے کے نام پر سڑکوں کے نام رکھے گئے ہیں اس پر فلمیں بن چکی ہیں۔ اس کے ڈاک ٹکٹ جاری ہو چکے ہیں۔

پیلے اچھا کھیلتا تھا۔ برازیل میں اور برازیل سے باہر وہ بے حد عزت کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ کھیلنے کے لیے اُسے بڑے پیسے ملتے تھے۔

۱۹۶۲ء اور ۱۹۶۶ء میں کھیلے گئے ورلڈ کپ ٹورنامنٹوں کے بعد اُس نے کھیل سے ریٹائر ہونے کا اعلان کیا۔ لیکن دوستوں کے بار بار کہنے پر اُسے ایک بار یعنی چوتھی بار پھر برازیل کے لیے ورلڈ کپ ٹورنامنٹ میں کھیلنا پڑا۔ اس کی پریشانی کا اندازہ ایک اور بات سے بھی کر سکتے ہیں: خیال ہے کہ جتنا وقت پیلے کھیل کے میدان میں صرف کرتا تھا اُس سے زیادہ وقت اسے ڈاکٹروں کی معائنے کی میز پر صرف کرنا پڑتا تھا۔ خیر، تو پیلے ریٹائر ہو گیا۔ اُسے واپس میدان میں آنے کی کوشش بہت دنوں جاری رہی۔ رقم کی بھاری پیش کش واقعی سر چکرا دینے والی تھی۔ نیویارک کی کاسموس فٹ بال ٹیم نے پیلے کو اور آئرلینڈ کے کھلاڑی جارج بیسٹ کو دس دس لاکھ ڈالر کی رقم کی پیش کش کی تھی۔ جارج بیسٹ نے پیش کش قبول کر لی۔ اب اُسے دو برس کے عرصے میں کاسموس کے لئے چالیس میچ کھیلنے ہوں گے۔

اور پیلے؟

پیلے نے نرمی سے انکار کیا۔ جواب دیا کہ سوچ کر بتائے گا۔ اس پر کاسموس نے معاوضے کی رقم دس سے ۴۵ لاکھ ڈالر کر دی اور جب پیلے اس پر بھی راضی نہ ہوا تو اس کلب نے ساٹھ لاکھ ڈالر کی پیش کش کی اور تین برس کلب کے لیے کھیلنے کی شرط لگائی۔ شاید کُل ساٹھ میچ کھیلنے کی۔ گویا معاوضہ ایک میچ کے لیے ایک لاکھ ڈالر ٹھہرا۔ ہے نا حیرت انگیز رقم!

پیلے نے اس پر بھی انکار کر دیا۔ جواب میں کہا کہ اس رقم سے کہیں زیادہ اُسے اپنے گھر کا سکون عزیز ہے۔ تاہم بعد میں بعض مصلحتوں کے پیش نظر اُس نے کاسموس کے لیے کھیلنا قبول کر لیا۔

دیکھو بات کہاں سے شروع ہوئی تھی اور کہاں پہونچی۔ ہم کھلاڑیوں کو دیئے جانے والے اعزازوں کی بات کر رہے تھے۔ میرے کھلاڑیوں کو اعزاز صرف سرکاریں ہی نہیں دیتیں۔ کھیلوں کے رسالے اور اخبار بھی دیتے ہیں۔ یہ اعزاز کیسے ہوتے ہیں؟ انہیں سال کا بہترین کھلاڑی قرار دیا جاتا ہے۔ مثلاً ۱۹۷۰ء کے لیے یورپ کا بہترین فٹ بال کھلاڑی گرڈ مُولر قرار پایا۔ مولر کو یہ اعزاز فرانس کے ایک ہفتہ وار اخبار "فرانس فٹ بال" نے ایک رائے شماری کے بعد دیا۔ رائے تیس یورپی ملکوں کے چنے ہوئے اخبار نویسوں سے لی گئی تھی۔ رائے شماری میں دوسرے نمبر پر انگلستان کا سنٹر ہاف بوبی مور رہا پیلے کے ساتھ ان دونوں کھلاڑیوں — گرڈ مُولر اور بوبی مور کا ذکر بھی بہت مناسب معلوم ہوتا ہے۔ مُولر میرا وہ کھلاڑی ہے جس نے ورلڈ کپ ٹورنامنٹوں میں باقی تمام کھلاڑیوں سے زیادہ گول کئے۔ پیلے سے بھی زیادہ۔ اس نے تیرہ گول کئے۔ دو میچ ایسے تھے جس میں اس نے تین تین گول کئے۔ اور پیرو کے خلاف میچ میں اس نے تینوں گول ایک کے بعد ایک، کچھ اس طرح کئے کہ دیکھنے والے دنگ رہ گئے —

اُس سے پہلے صرف دو کھلاڑی ایسے ہیں جنہوں نے ورلڈ کپ ٹورنامنٹ میں مُولر سے زیادہ گول کئے ہیں۔ یہ کھلاڑی ہیں — فونٹین اور کِک سِوس۔ فونٹین نے ۱۹۵۸ء میں فرانس کی ٹیم کے لیے ۱۳ اور کِک سِوس

نے ۱۹۵۴ء میں ہنگری کے لیے ۱۱ گول کئے۔ ۱۹۷۴ء میں سَب سے زیادہ گول پولینڈ کے کھلاڑی لاٹو نے کئے۔ اب مُولر بین الاقوامی مقابلوں سے ریٹائر ہوگیا ہے۔

ہاں بڑے مقابلوں کی باتیں بھی بڑی ہوتی ہیں۔ مثلاً ورلڈ کپ ٹورنامنٹ میں اٹلی اور مغربی جرمنی کے درمیان کھیلا گیا سیمی فائنل میچ۔ دونوں ٹیمیں ٹکر کی تھیں۔ ایک دوسرے کا جواب تھیں۔ ان بڑی یورپی ٹیموں کے کھلاڑیوں کی کش مکش، بھاگ دوڑ، لپک جھپٹ انسانی برداشت سے باہر کی چیزیں تھیں۔ کھیل میں اتنی تیزی تھی کہ کسی کھلاڑی کو بھی اپنا ہوش نہیں تھا۔ حد تو یہ ہے کہ زخمی کھلاڑی اپنا درد بھول گئے تھے۔ مغربی جرمنی کے کھلاڑی بیکن باؤر کا زخمی بازو گلے میں بندھی پٹی میں پھنسا ہوا تھا۔ اور وہ سَب کچھ بھولے ہوئے کھیل رہا تھا۔ پہلے تو کوئی ٹیم گول نہ کر پائی۔ پھر آدھ گھنٹے کے فاضل وقت میں پانچ گول ہوئے۔ ایک ادھر سے تو ایک اُدھر سے۔ اور پھر جیت اٹلی کی ہوئی۔ اٹلی کے لیے تیسرا گول ریویرا نے کیا۔

گول کرنے اور ہار کو جیت میں بدلنے کے سلسلے میں مغربی جرمنی کی ٹیم کا کوئی جواب نہیں۔ سیمی فائنل میں اٹلی سے ہارنے والی اس ٹیم نے کوارٹر فائنل میں ۱۹۶۶ء کے عالمی کپ چیمپئن انگلستان کو جس طرح ہرایا، وہ اسی کا حصّہ ہے۔ انگلستان کی ٹیم کے لیے ایلن میولیری، مارٹن پیٹرز دو گول کر چکے تھے۔ انگریز کھلاڑیوں نے اپنی جیت کو یقینی سمجھ لیا تھا۔ پھر فرانز بیکن باؤر نے ایک گول کیا۔ اس کے بعد اوئے سیلر نے دوسرا گول بھی اُتار دیا۔ اب کھیل کا رُخ بدل گیا۔ باری میرے کھلاڑی مُولر کی تھی۔ وہ کب چوکنے والا تھا۔ اپنی ٹیم کے لیے تیسرا گول اُس نے کیا، اور انگلستان کی ٹیم کی جیت کو ہار میں بدل دیا۔ سیمی فائنل میں اٹلی کے خلاف بھی گول مُولر ہی نے کئے تھے۔

تمہیں ایک بات بتاؤں؛

عجیب!

دلچسپ!

تم جانتے ہو نا! اب بہت سارے کام کمپیوٹروں کی مدد سے کئے جانے لگے ہیں۔ ورلڈ کپ ٹورنامنٹ کے سلسلے میں بھی کمپیوٹر نے بڑی دلچسپ پیشین گوئی کی تھی!۔۔۔۔ انگلستان کی ٹیم فائنل میں فاضل وقت میں برازیل کی ٹیم سے ۲ کے مقابلے میں ۳ گولوں سے جیت جائے گی۔ لیکن ہوا اس کے اُلٹ۔ یعنی انگلینڈ کی ٹیم کوارٹر فائنل ہی میں مغربی جرمنی کی ٹیم سے ہار گئی۔ سوچو تو: میرے کھلاڑی مشین کی بات بھلا کب ماننے والے تھے۔

گول ایجاد کرنے کے اطالوی محاورے کا ذکر میں کر چکا ہوں۔ سوچتا ہوں، تمہیں مختصر طریقے پر یہ بھی بتا دوں کہ میرے مشہور کھلاڑی جارج بیسٹ، ڈرینگن نرے جیک، پیلے وغیرہ کیسے گول "ایجاد" کرتے تھے۔

جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں: پچھلے دنوں میرے کھیل کا رنگ ڈھنگ بدل گیا تھا۔ اب کھیل کے ہنر پر کم اور طاقت اور رفتار پر زیادہ دھیان دیا جانے لگا تھا۔ کھلاڑیوں کی پہلی کوشش یہ ہوتی تھی۔ کہ دوسری ٹیم کے کھلاڑی کو گول نہ کرنے دیں۔ ایسے میں گول کرنے والے

کھلاڑیوں کی مانگ کا بڑھنا ضروری تھا اور یہی وجہ ہے کہ ٹومی لاٹن ڈکسی ڈین، اٹلی کے پیٹولا اور برازیل کے لوئی ڈس جیسے گول کرسکنے والے میرے کھلاڑیوں کو کلب منہ مانگی فیس دینے کو تیار رہتے تھے۔ پیٹروناس تسی، مارٹن پیٹرز، ایلن کلارک جیسے کھلاڑیوں کے تبادلے کے لیے حیرت میں ڈالنے والا معاوضہ بھی اسی بات کا پتہ دیتا ہے۔ اور اسی سبب سے اطالوی کھلاڑی لوئی گی ریوا کو بیش قیمت سمجھا جاتا ہے۔ اور اس کے تبادلے کے لیے کوئی قیمت مناسب نہیں سمجھی جاتی۔ لوئی گی ریوا بھی کسی افسانوی کردار سے کم نہیں۔ ایک بار اٹلی کے ایک اخبار نے یہ جاننے کے لئے رائے شماری کی کہ اٹلی کی سَب سے مشہور شخصیت کونسی ہے۔ رائے شماری کا نتیجہ دلچسپ نکلا تھا۔ عالمی شہرت والی ایکٹریس صوفیہ لورین تیسرے نمبر پر رہی۔ مسیحی دُنیا کا سربراہ پاپائے اعظم دُوسرے نمبر پر آیا۔ پہلا نمبر طلائی جوتوں والے کھلاڑی ریوا کا رہا۔

بات گول کرنے والے کھلاڑیوں کی چل نکلی ہے تو مغربی جرمنی کی پچھلی عالمی کپ ٹیم کے بیک پال برٹنر کا ذکر بہت مناسب معلوم ہوتا ہے۔

بیک اور گول کرنے والا کھلاڑی!

ہاں برٹنر کو آوارہ بیک کہتے ہیں۔ ۱۹۷۴ء کے عالمی کپ ٹورنامنٹ میں اس نے دو گول کئے تھے۔ جرمنی کی جیت میں اس کا نمایاں حصّہ تھا۔

آج کل بامِ شہرت پر ایک ڈچ کھلاڑی کرُوف ہے۔ یہ اس وقت یورپ میں سَب سے زیادہ پیسے پانے والا کھلاڑی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اُسے ہر منٹ کھیل کے لیے ایک سو پونڈ یعنی تقریباً دو ہزار روپے ملتے ہیں۔ منٹوں کے حساب سے بات شاید صاف نہ ہو یوں سمجھ لو کہ فٹ بال سے اس کی روزانہ آمدنی چھ ہزار روپے ہے اور اتنی ہی رقم اُسے اشتہاری کمپنیاں دیتی ہیں۔ وہ ستائیس برس کا ہے۔ اس کی زندگی پر فلم بھی بن چکی ہے۔ وہ اپنی قومی زبان کے علاوہ انگریزی، ہسپانوی، جرمن، اور فرنچ بھی بول سکتا ہے۔ کرُوف کو پیلے کا جانشین قرار دیا جاتا ہے۔ اسپین کی ٹیم بارسلونا نے اُسے حاصل کرنے کے لئے ہالینڈ کے مشہور کلب ایجکس کو تقریباً دو کروڑ روپے (۹۶۵۰۰۰ پونڈ) دیے ہیں۔

روپیہ پیسہ —

عزت —

اعزاز —

خاصی باتیں ہوگئیں۔ اپنی بات ختم کرنے سے پہلے سوچتا ہوں۔ کچھ باتیں اپنے کھلاڑیوں کی شہرت اور مقبولیت کے بارے میں بتا دوں — پیلے کی مثال مناسب ہوگی۔ پیلے بڑا مقبول کھلاڑی ہے۔

ہاں: میں کئی ساری عجیب غریب اور دلچسپ مثالیں دے سکتا ہوں۔ تازہ مثال ۱۹۷۰ء میں کھیلے گئے ورلڈ کپ ٹورنامنٹ کے فائنل سے لے سکتے ہیں۔ اِدھر ریفری نے فائنل میچ کے خاتمے کی سیٹی بجائی، اُدھر پیلے کے چاہنے والوں کا ایک ریلا سا

آگیا۔ پولیس والے اور دوسرے لوگ بھلا اسے کیا روک پاتے۔ لوگوں نے بڑھ کر پیلے کو کندھوں پر اٹھالیا۔ چاہنے والوں کی کھینچ تان اور لپک جھپٹ میں پیلے کے کپڑے تک پھٹ گئے۔ وہ لگ بھگ ننگا تھا۔ لیکن اس کے چاہنے والے اُسے اُٹھائے اُٹھائے میدان میں گھُما رہے تھے۔

تم کہو گے یہ تو بڑی وقتی بات ہوئی۔ اس سے مقبولیت کا اندازہ کیسے لگایا جاسکتا ہے۔ چلو ایسا ہی ہی۔ تو کوئی دوسری مثال دوں۔ سنو۔

جوتے بنانے والی دو فرموں میں ایک جھگڑا اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ ایک انگریز فرم اسٹائلو تھی۔ اور دوسری جرمن فرم پوما۔

اس جھگڑے کی وجہ تھا پیلے۔ اُن میں سے ہر ایک فرم کا کہنا تھا کہ پیلے نے اُس سے معاہدہ کیا ہے کہ وہ صرف اسی کے بنائے ہوئے جوتے پہنے گا۔ اب بتاؤ یہ فرمیں اپنا کاروبار چمکانے کے لیے پیلے کی مقبولیت ہی سے تو فائدہ اُٹھانا چاہتی تھیں نا۔

انگریز کھلاڑی گریوز کھیلنے کے علاوہ ماڈل کا کام بھی کرتا ہے۔ وہ اس کام سے ۲۵۰۰۰ پونڈ سالانہ کماتا ہے۔ ورلڈ کپ میں انگلینڈ کی ٹیم کے کپتان بوبی مُور کی مثال اور بھی دلچسپ ہے۔ سر کے بالوں کے لیے تیل بنانے والی ایک کمپنی نے اس کی مقبولیت سے بے حد فائدہ اُٹھایا۔ یوں کہ مور ٹیلی ویژن پر اس فرم کی اشتہاری مہم چلاتا تھا اور اندازاً تیس ہزار روپے اُجرت پاتا تھا۔

اسی طرح جرمنی میں مختلف چیزوں کی اشتہاری مہموں کے لیے میرے جرمن کھلاڑیوں گرڈ مُولر اور بیکن باؤر کی بڑی مانگ ہے۔ اِدھر مُولر کو چاکلیٹ بنانے والی ایک کمپنی نے صرف ایک اشتہاری مہم کے لیے ۲۰۰۰ پونڈ دیے تھے۔

ہاں اس بات کو تم اس طرح بھی کہہ سکتے ہو کہ میرے کھلاڑی اپنی مقبولیت سے فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔ کون فائدہ اُٹھا رہا ہے؟ اس سے مجھے کوئی بحث نہیں۔ میں تو صرف اپنے کھلاڑیوں کی مقبولیت کے بارے میں بتانا چاہتا تھا۔ سو بتا چکا ـــ





میرے ہندوستانی کھلاڑی

میں تمہیں اپنے اچھے غیر ملکی کھلاڑیوں کے بارے میں بہت سی باتیں بتا چکا ہوں۔ سوچتا ہوں: اب کچھ باتیں اپنے اچھے ہندوستانی کھلاڑیوں کے بارے میں بھی بتاؤں۔ اس طرح بات بڑی حد پوری ہو جائے گی۔

ایک بات پہلے بتا دوں — یہ کہ ہندوستان میں میرے کھلاڑیوں کو دوسرے ملکوں کے کھلاڑیوں جتنا روپیہ پیسہ نہیں ملتا۔ ہندوستان میں پیشہ ورانہ کھیل کا رواج نہیں۔ لیکن ایسا نہیں کہ میرے ہندوستانی کھلاڑی میری وجہ سے کماتے کھاتے نہیں۔ یا یہ کہ میں اُن کا دھندہ نہیں۔ پیشہ ورانہ کھیل کی ایک صورت نیم پیشہ ورانہ کھیل ہے۔ ہندوستان میں اس کھیل کا رواج ہے۔ ہوتا یوں ہے — میرے کھلاڑیوں کو کئی بہانوں سے رقمیں دی جاتی ہیں۔ اور ٹیموں اور کلبوں کے لیے کھیلنے کو کہا جاتا ہے۔ اس کا ایک طریقہ یہ ہے — بعض بڑی فرمیں کمپنیاں میرے اچھے کھلاڑیوں کو اپنے یہاں ملازم رکھ لیتی ہیں۔ تنخواہ کام کی دیتی ہیں۔ لیکن خاص کام کھیلنا ہوتا ہے۔ ایسی نوکری کی بات دوسری ہے۔ لیکن میرے نیم پیشہ ور کھلاڑی مختلف طریقوں سے دو تین سو روپے سے لے کر پندرہ سو روپے مہینہ تک پاتے ہیں۔

ہاں یہ بھی صحیح ہے کہ ہندوستان سے باہر اُنہیں دُنیا کے دوسرے

اوپر: چُنّی گوسوامی
دوسری قطار دائیں سے:
ارون گھوش
سیلن منا
لطیف
تیسری قطار:
وینکٹیش
نور محمد
معین
نیچے:
میوہ لال
احمد خاں

بڑے اور اچھے کھلاڑیوں جیسی شہرت نہیں ملی لیکن ملک کے اندر وہ بے حد مقبول ہیں۔ یہ باتیں اپنی جگہ اہم ہیں لیکن اُن سے زیادہ اہم میرا اچھا کھیل ہے۔ تو آؤ تمہیں کچھ باتیں اپنے اچھے ہندوستانی کھلاڑیوں کے بارے میں بتاؤں۔

اپنے کھلاڑی صمد کا نام میں پہلے بھی لے چکا ہوں۔ میرے اچھے ہندوستانی کھلاڑیوں میں صمد کا نام ہمیشہ سُنہرے حرفوں میں لکھا جائے گا۔ صمد میرے لیے وہی کچھ تھا جو دھیان چند ہاکی کے لیے تھا۔ صمد کو میرا جادوگر ٹھیک ہی کہا جاتا ہے۔ اس کے پیروں کے ساتھ جیسے میرے لیے مقناطیس لگا ہوتا تھا۔ میں اس کے پیروں میں کیا پہونچا کہ پھر گول کے پیچھے تنے ہوئے جال ہی میں تیرتا ہوا نظر آتا۔ ایسے کہ تمام کھلاڑی حیران کھڑے کے کھڑے رہ جاتے۔

صمد نے ۱۹۲۵ء میں موہن بگان میں کھیلنا شروع کیا تھا۔ بعد کو یعنی ۱۹۳۴ء میں محمڈن اسپورٹنگ میں آگیا تھا۔ وہ تیز رفتار کھلاڑی تھا۔ ایسا کہ سات آٹھ کھلاڑی بھی اُسے روک نہ پاتے۔ اگر آج وہ زندہ و کھیلتا ہوتا تو اُسے بھی شاید برازیلی کھلاڑی پیلے جیسی عزت و شہرت ملتی۔ وہ بڑا من موجی کھلاڑی تھا۔ موج میں آتا تو کہہ کر گول کر لیتا۔

صمد کے بے مثال کھیل کی کئی کہانیاں مشہور ہیں۔

ایک واقعہ یوں بیان کیا جاتا ہے: یہ اُن دنوں کی بات ہے جب محمڈن اسپورٹنگ کے اچھے کھیل کی دھوم ہندوستان بھر میں تھی۔ مہاراجہ اور مہارانی دربھنگہ کو محمڈن کا کھیل دیکھنے کی خواہش ہوئی۔ محمڈن اسپورٹنگ دربھنگہ بلالی گئی۔ اس کا مقابلہ بہار کے چُنے ہوئے کھلاڑیوں کی ایک ٹیم سے تھا۔

محمڈن اور خاص کر اس کے لِفٹ آؤٹ کھلاڑی صمد کے اچھے کھیل کی بڑی شہرت تھی۔ لیکن ہوا ایسا کہ محمڈن آدھے وقت کا کھیل ختم ہونے تک ایک بھی گول نہ کر پائی۔ مہارانی کو محمڈن اسپورٹنگ سے بڑی مایوسی ہوئی۔ وہ مہاراجہ سے بولیں "یہی صمد ہے: جس کا اتنا نام ہے۔ یہ تو کچھ اچھا کھلاڑی نہیں۔" اور مہاراجہ نے بھی "ہاں" میں سر ہلا دیا۔

مہاراجہ نے محمڈن اسپورٹنگ کے ایک عہدیدار سے شکایت کی ۔ "صمد تو بیکار نکلا۔ ہم تو اس کا کھیل دیکھنے آئے تھے۔"

یہ بات صمد کو بتائی گئی۔ صمد مہارانی کے پاس آیا۔ بولا: "مہارانی صاحبہ آپ کیا چاہتی ہیں؟" جواب تھا: "میں چاہتی ہوں: تین منٹوں میں تین گول آپ خود کردیں۔"

صمد چلا گیا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے بات کی۔ کھیل شروع ہوا۔ میں دو منٹوں کے اندر ہی سائڈ لائن پر صمد کو مل گیا۔ اب کیا تھا، مجھے پیروں میں لیے وہ دوڑا۔ مخالف ٹیم کے تمام کھلاڑیوں پر اس جادوگر کا جادو اثر کرچکا تھا۔ کوئی کھلاڑی بھلا اُسے کیا روک پاتا۔ وہ پلک جھپکتے ہی پنلٹی ایریا میں تھا۔ دوسرے ہی پل میں اس نے بائیں پاؤں سے شاٹ لیا۔ میں زمین سے لگتا ہوا چلا۔ اور گول میں تھا۔ سب کے سب صمد کی بجلی کی سی تیزی پر حیران تھے۔ ایک گول ہوچکا تھا۔

پھر دو گول اور ہوئے۔ محمڈن اسپورٹنگ نے یہ میچ چھ گولوں سے جیتا۔ یہ جادوگر صمد کا کمال تھا۔ اس کے کمال پر خوش ہوکر مہارانی نے اپنا سونے کا ہار صمد کو تحفے میں دے دیا۔

صمد کی جادوگری کا ایک واقعہ اور سُنو۔ یہ پہلے سے کہیں زیادہ حیرانی میں ڈالنے والا ہے۔ کہتے ہیں: نواب ناظم مرشدآباد نے محمڈن اسپورٹنگ کو کھیلنے کی دعوت دی۔ محمڈن کا مقابلہ بنگال کے چنے ہوئے کھلاڑیوں کی ایک ٹیم سے تھا۔

یہ میچ بہت زبردست ہوا۔ رشید، رحیم اور رحمت گول کرنے میں ناکام رہے تھے۔ پھر صمد موج میں آیا۔ اُس نے تین بار تمام کھلاڑیوں کو پیچھے چھوڑتے ہوئے پنلٹی ایریا میں آکر کک لگائی۔ میں تینوں بار اوپر والی بلی یعنی کراس بار سے ٹکرایا اور لوٹ آیا۔ صمد چکرایا کہ بات کیا بنی۔ اُس نے نواب ناظم اور ریفری سے شکایت کی کہ گول کی اونچائی تین انچ کم ہے۔ اس پر اُونچائی ناپی گئی۔ اونچائی واقعی تین انچ کم نکلی۔ سب دانتوں میں اُنگلیاں دبا کر رہ گئے۔ ایسی اور بھی مثالیں دی جاسکتی ہیں، لیکن سب سے ایک ہی بات ثابت ہوگی۔ صمد جادوگر تھا۔ اور بے حد اچھا

کھلاڑی۔ وہ تقسیم کے بعد پاکستان چلا گیا تھا۔ وہیں اس کا انتقال ہوا۔

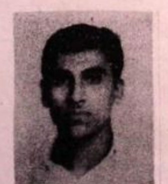
محمڈن اسپورٹنگ کا ایک دوسرا بہت اچھا کھلاڑی عظیم رائٹ آؤٹ سلیم تھا۔ سلیم کے بعد اس کی کمی نور محمد جونیئر نے پوری کی۔ سلیم ننگے پاؤں کھیلا کرتا تھا۔ وہ ہمیشہ ہندوستان کی ٹیم میں چنا جاتا رہا۔ یورپی کھلاڑی اس کے کھیل کو دیکھ کر دنگ رہ جاتے تھے۔ اس کے حیرانی میں ڈالنے والے کھیل کو دیکھ کر کلکتہ فٹ بال کلب کا ایک کھلاڑی اُسے اپنے ساتھ انگلینڈ لے گیا۔ وہاں پانی سے بھرے میدان میں اُس نے کھیل کا وہ کمال دکھایا — ایسے گول کئے کہ دیکھنے والوں کو یقین ہی نہیں آیا۔ یورپی تماشائی اس کے پیروں کو چھو کر دیکھتے تھے کہ کہیں یہ لوہے کے تو نہیں۔

میرا ایک دوسرا بہت اچھا کھلاڑی مونا دت تھا۔ حافظ رشید کے بعد اُسے ہندوستان میں میرا بہترین فارورڈ مانا جاتا ہے۔ وہ موہن بگان میں کھیلتا تھا۔ موہن بگان کی کامیابیوں میں اس کا بہت بڑا حصّہ ہے۔

مونا دت کے بعد میوہ لال میرا ایسا سنٹر فارورڈ کھلاڑی ہے، جس کا نام میری تاریخ کے صفحوں میں ہمیشہ باقی رہے گا۔ اگر بڑے مقابلوں میں کئے گولوں کی تعداد کو سامنا رکھا جائے تو میوہ لال کو ہندوستان کا پیلے کہا جاسکتا ہے۔ میوہ لال نے کھیلنا کلکتہ کی آرین کلب سے شروع کیا۔ بعد کو وہ موہن بگان میں آگیا۔ ورلڈکپ، اولمپک اور ایشیائی کھیلوں میں وہ ہندوستان کی طرف سے کھیل چکا ہے۔ فرسٹ کلاس یعنی اوّل درجے کے میچوں میں اس نے ایک ہزار سے زیادہ گول کئے۔ اس جیسا گول کرنے والا دوسرا کھلاڑی ہندوستان میں پیدا نہیں ہوا۔ سنتوش ٹرافی میں تو اس کا ریکارڈ ہے۔ وہ بنگال کی طرف سے اس مقابلے میں چودہ بار کھیلا۔ اس نے ۲۵ گول بنائے۔ پانچ میچوں میں تین تین گول کئے۔ اس کے بعد سے کوئی دوسرا کھلاڑی ایسے کھیل کی مثال پیش نہیں کرسکا۔ ہاں یہ بھی عجب اتفاق ہے — میوہ لال اپنے بے حد اچھے کھیل کے باوجود ہارنے والی ٹیموں کا کھلاڑی رہا۔







اوپر سے نیچے:
نیول ڈی سوزا
بلرام
پی کے بنرجی

میرا ایک اور اچھا سنٹر فارورڈ کھلاڑی این ڈی سوزا ہے۔ وہ ابھی کچھ دن پہلے تک بمبئی کی مشہور ٹیم ہفت لال گروپ میں کھیلتا تھا۔ ۱۹۵۶ء میں ملبورن میں ہوئے اولمپک کھیلوں میں اس نے آسٹریلیا کے خلاف ایک کے بعد ایک یعنی تین گول کئے تھے۔ یوگوسلاویہ کے خلاف سیمی فائنل میں بھی اس کا کھیل بہت اچھا رہا۔ اس مقابلے میں ہندوستان کو ہار ہوئی تھی لیکن میچ کا پہلا گول ڈی سوزا ہی نے کیا تھا۔ اس پر اس کی بڑی تعریف ہوئی تھی۔

بال رحمت اور احمد کے بعد میرا ایک اچھا کھلاڑی چنی گوسوامی ہے۔ میرا بہت اچھا کھلاڑی ہونے کے ناطے جو عزت شہرت اور مقبولیت چنی گوسوامی کو ملی، وہ کسی دوسرے کے حصے میں نہیں آئی۔ جب وہ موہن بگان میں آیا تو کل تیرہ چودہ برس کا تھا۔ یہ بات ۱۹۵۲ء کی ہے۔ بلرام اور چنی گوسوامی میرے بہترین ان سائڈ فارورڈ مانے جاتے تھے۔ چند برس ہوئے چنی میرے۔ بڑے مقابلوں سے ریٹائر ہوگیا ہے۔ وہ اولمپک، ایشیائی اور دوسرے عالمی مقابلوں میں ہندوستان کی طرف سے کھیل چکا ہے۔ وہ بنگال کی ٹیم کا کپتان بھی رہا ہے۔ چنی گوسوامی کو کھیلوں کا قومی اعزاز ارجن ایوارڈ بھی مل چکا ہے۔

میرا ایک دوسرا کھلاڑی جسے ارجن ایوارڈ ملا، پی کے بنرجی ہے۔ پی۔ کے بنرجی جمشید پور میں پیدا ہوا۔ وہیں اس نے کھیلنا شروع کیا اور بڑی شہرت پائی۔ ۱۹۵۴ء میں وہ آرین (کلکتہ) میں شامل ہوگیا تھا۔ پھر ایسٹرن ریلوے اسپورٹس کلب میں چلا گیا۔ بنرجی ایشیائی کھیلوں میں ہندوستانی ٹیم کا کپتان بھی رہا۔ وہ متعدد بیرونی مقابلوں میں ہندوستان کی طرف سے شریک ہوا۔ وہ سنتوش ٹرافی میں ریلوے کی ٹیم کے لیے کھیل چکا ہے۔ وہ ریلوے کی ٹیم کا کپتان بھی رہا ہے۔ وہ بڑے مقابلوں سے ریٹائر ہو چکا ہے؛ وہ میوہ لال بنا اور جرنیل سنگھ کی طرح میرے کھلاڑیوں کی تربیت کرتا ہے۔ اور جرنیل سنگھ ہی کی طرح اس کمیٹی کا ممبر ہے جو باہری مقابلوں کے لیے ہندوستانی ٹیم کے کھلاڑی چنتی ہے۔ ہندوستان میں کھیل کے معیار کو بلند بنانے کے لیے جی ایم ایچ پاشا، کنو اور محمد حسین نے بھی لائق تعریف خدمت







اوپر سے نیچے
سبھاش بھومک
سرجیت سین گپتا
انگا ناتھن

انجام دی ہے۔

ذکر گول کرنے والے کھلاڑیوں کا چل نکلا۔ ایسے میں سید عابد حسین کا نام زبان پر آنا ضروری ہے۔ محمڈن اسپورٹنگ کا یہ بہترین ذہین ان سائڈ کھلاڑی مانا جاتا تھا۔ عابد نے ملک سے باہر کئی مقابلوں میں ہندوستان کی نمائندگی کی ہے۔ اس کا ایک کمال اور بھی تھا۔ یعنی وہ فارورڈ لائن میں کسی بھی پوزیشن پر کھیل سکتا تھا۔

ایسا ایک دوسرا کھلاڑی بلرام تھا۔ حیدرآباد کے اس کھلاڑی نے شہرت حیدرآباد پولیس کی ٹیم میں کھیل کر پائی۔ بلرام نے اولمپک کھیلوں میں بھی ہندوستان کی نمائندگی کی بعد میں وہ ایسٹ بنگال میں چلا آیا۔ پھر ۱۹۶۵ء میں بی این ریلوے میں چلا گیا۔ لیکن جلد ہی بیماری کی وجہ سے اُسے کھیلنا چھوڑ دینا پڑا۔

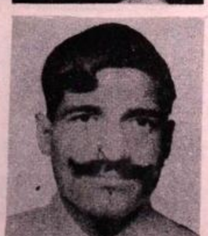
اندر سنگھ کا ذکر پہلے بھی کر چکا ہوں۔ لیکن گول کرنے والے کھلاڑیوں کا ذکر اس کے بغیر ادھورا رہے گا۔ اندر سنگھ نے ۱۹۷۴ء میں سنتوش ٹرافی کے مقابلوں میں ۲۳ گول کئے تھے۔

ایک اور کھلاڑی جس نے اولمپک اور ایشیائی مقابلوں میں بہت اچھا کھیل دکھایا وہ موہن بگان کا ان سائڈ لفٹ پورن بہادر تھا۔ اس نے تیسرے ایشیائی فواڈر نگر میں پاکستان کے خلاف فائنل میچ میں ایک کے بعد ایک ... تین گول کر کے تماشائیوں اور کھلاڑیوں کو حیرت میں ڈال دیا تھا۔ میرے اچھے فارورڈ کھلاڑیوں میں حیدرآباد کے عزیز اور معین بھی ایک مقام رکھتے تھے۔

اِن دنوں ملک میں جن فارورڈ کھلاڑیوں کی دھوم ہے، ان میں سے حبیب، گھوش دستی دار، جاہر داس، مگن سنگھ، شام تھاپا، امر بہادر، رنجیت، اکبر، سرجیت سین گپتا، سوپن سین گپتا کا ذکر خاص طور پر ضروری ہے۔ حبیب، اکبر، شام تھاپا، انگا ناتھن اور سبھاش بھومک ہندوستان کی طرف سے کئی مقابلوں میں کھیل چکے ہیں۔ مگن سنگھ بھی کئی باہری مقابلوں میں اپنے اچھے کھیل کا کمال دکھا چکا ہے۔ وہ گول کرنے میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ کشمیر کا کھلاڑی یوسف ڈار بھی بڑی صلاحیتوں والا کھلاڑی ہے۔ وہ چودہ برس کی عمر میں ڈیورنڈ میں کھیلا تھا۔ محمڈن کا یہ کھلاڑی







اوپر سے نیچے:
حبیب
اندر سنگھ
مگن سنگھ







اوپر سے نیچے:
یوسف ڈار
اکبر
شام تھاپا

اب واپس اپنے وطن سری نگر چلا گیا ہے۔ تاہم اس کا امکان ہے کہ وہ غیر ملکی مقابلوں میں جانے والی ہندوستانی ٹیم میں کبھی شامل ہو۔ اب بیک کھلاڑیوں کے بارے میں کچھ باتیں ــــ جمعہ خاں اور بچی خاں کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں۔ پچھلے عرصے میں جن بیک کھلاڑیوں نے اپنا نقش جمایا ہے ان میں اردن گھوش، نور محمد، عقیل احمد، سلام، جرنیل سنگھ اور بینی پرشاد کا نام خاص طور پر لیا جا سکتا ہے۔ اردن گھوش نے کئی باہری مقابلوں میں حصہ لیا۔ وہ ایک برس مرڈیکا میں شریک ہندوستانی ٹیم کا کپتان بھی رہا ہے۔ وہ شروع میں ہوڑہ یونین میں کھیلا۔ پھر موہن بگان میں آگیا اور پھر ایسٹ بنگال نے اس کی خدمات حاصل کر لیں۔ بعد کو وہ بی این ریلوے کے لیے کھیلا۔ اس کا شمار ہندوستان کے بہترین بیک کھلاڑیوں میں ہوتا ہے۔ بینی پرشاد موہن بگان کا بہترین سینٹر ہاف کھلاڑی تھا۔ موہن بگان کا بیک چندر شیور پرشاد اسی پرشاد گھرانے سے ہے۔ چندر شیور پرشاد کئی ملکی اور غیر ملکی مقابلوں میں بنگال اور ہندوستان کی طرف سے کھیل چکا ہے۔ وہ ۱۹۷۱ء میں مرڈیکا ٹورنامنٹ میں حصہ لینے والی ہندوستانی ٹیم کا کپتان چنا گیا تھا۔

میرا ایک اچھا بیک کھلاڑی ایس منا ہے۔ وہ موہن بگان میں کھیلتا تھا۔ وہ موہن بگان کا کپتان بھی رہا۔ وہ اولمپک کھیلوں میں شریک ہندوستانی ٹیم کا کپتان بھی رہا ہے۔ محمڈن کے جمعہ خاں کی طرح وہ بنگال میں "دیوارِ چین" کہلاتا تھا۔ وہ ۱۹۵۷ء میں بڑے مقابلوں سے ریٹائر ہو گیا تھا۔ وہ اب میرے کھلاڑیوں کی تربیت کرتا ہے۔ جرنیل سنگھ اور منا کی طرح میرا ایک دوسرا اچھا بیک کھلاڑی الطاف ہے۔ وہ بنگلور میں پیدا ہوا۔ پہلے میسور کی ٹیم میں کھیلا۔ وہیں سے اس کی شہرت پھیلی۔ وہ اب محمڈن اسپورٹنگ میں کھیلتا ہے۔ کچھ دنوں وہ موہن بگان کے لیے بھی کھیل چکا ہے۔ حال میں ہوئے ایشیائی مقابلوں اور مرڈیکا ٹورنامنٹ میں وہ ہندوستان کی طرف سے کھیلا تھا۔ تمہیں الطاف کی ایک خاص بات بتاؤں! ــــ یہ کہ الطاف بہت سکون سے کھیلتا ہے۔ بہت کم فارورڈ کھلاڑی ایسے ہیں جو الطاف کو الجھن میں ڈال کر مجھے اس سے نکال کر لے جائیں۔

الطاف کی طرح بنگلور کا ایک دوسرا کھلاڑی لطیف ہے۔ لطیف بھی الطاف کی طرح میسور کے لیے سنتوش ٹرافی میں کھیل چکا ہے۔ وہ ان دنوں محمڈن اسپورٹنگ میں کھیلتا ہے۔ اس کا شمار ملک کے بہترین ہاف بیک کھلاڑیوں میں ہوتا ہے۔ وہ جکارتا، کوالالمپور اور دوسرے باہری مقابلوں میں ہندوستان کی طرف سے کھیل چکا ہے۔

حیدر آباد کو بھی میرا گھر کہا جانا چاہیے۔ سلام جیسا اچھا لیفٹ بیک کھلاڑی مجھے حیدر آباد ہی سے ملا اور اب محمڈن اسپورٹنگ کا بیک نعیم بھی حیدر آباد ہی کا کھلاڑی ہے۔ نعیم پہلے ایسٹ بنگال میں کھیلتا تھا۔

ہندوستان کے بہترین بیک کھلاڑی جرنیل سنگھ کا ذکر میں پہلے بھی کر چکا ہوں۔ جرنیل سنگھ بھی میرے اُن کھلاڑیوں میں سے ہے، جنہیں ارجن ایوارڈ مل چکا ہے۔ جرنیل سنگھ کے بارے میں اتنا اور بتا دوں کہ پنجاب یونی ورسٹی کی ٹیم کے اس کپتان نے کھیلنا کلکتہ کی راجستھان کلب سے شروع کیا تھا۔ بعد میں وہ موہن بگان میں آگیا۔ جرنیل ایک باکمال کھلاڑی ہے۔ وہ عام طور پر بیک کی پوزیشن سے کھیلتا تھا۔ لیکن ایک بار ایک باہری مقابلے میں کوچ ایس۔ اے۔ رحیم کے کہنے پر وہ سینٹر فارورڈ کی پوزیشن سے بھی کھیلا تھا۔ ہندوستانی ٹیم جرنیل سنگھ کے کئے ہوئے گول ہی کی وجہ سے وہ میچ جیتی تھی۔ یہ بات جکارتہ ایشیائی کھیلوں کی ہے۔ ہمارا مقابلہ جنوبی ویٹ نام کی ٹیم سے تھا۔ اور یہ تو میں پہلے بتا ہی چکا ہوں کہ جرنیل سنگھ آج کل پنجاب کے نوجوان کھلاڑیوں کو میرے کھیل کی تربیت دیتا ہے۔

ہاں، تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو اگر میں تمہیں اپنے ہندوستانی کھلاڑیوں کے بارے میں یوں ہی بتاتا چلا جاؤں تو شاید یہ سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوگا۔ لیکن ــــ اچھا تو اس بات کو یہیں ختم کئے دیتا ہوں ــــ لیکن میرا جی چاہتا ہے تمہیں ان





اوپر سے نیچے
تھنگ راج
گوتم سرکار



کھلاڑیوں کے نام ہی بتا دوں، جو ان دنوں اپنی ریاست، اپنی ٹیم اور ہندوستان کے لیے اپنے کھیل کی وجہ سے سرمایہ سمجھے جاتے ہیں۔ ابھی کل کی بات ہے، ضمی، کنائی سرکار، باندیا، سمپت، پربجیت سنگھ اور تھنگراج اچھے گول کیپر مانے جاتے تھے۔ حیدرآباد پولیس کا گول کیپر سلیم بھی میرا بڑا اچھا کھلاڑی تھا۔ سدھیر کرم کار، کے سوہا، نعیم الدین، سی پرشاد، پی ایم شنو داس، این سین گپتا اور الطاف کا شمار ملک کے بہترین بیک کھلاڑیوں میں ہوتا ہے۔ ڈی نٹ راج، جے لبسی، مجائب سنگھ، عبداللطیف اور گوتم سرکار میرے اچھے ہاف بیک کھلاڑی ہیں۔

ان کے علاوہ جن کھلاڑیوں نے ملک میں پچھلے عرصے میں ہوئے مقابلوں میں اچھا کھیل دکھایا اُن میں این جالسن سیموَل، پی محی الدین کٹی، آئی انیتھونی اور بھوبندر سنگھ راوت کا ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔

ارے — اکتا گئے! تم اُوب سے گئے ہو۔ ناموں کا سلسلہ شاید کچھ لمبا ہوگیا ہے —

لو — تو بات ختم کئے دیتا ہوں۔



ہاں — بس صرف ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ مجھ سے ملے ہو۔ میری کہانی سُنی ہے۔ اب مجھ سے میدان میں کھیلنے بھی آنا۔ میدان کے باہر بیٹھ رہنے یا ٹیلی ویژن پر میرا کھیل دیکھ لینے میں کوئی مزہ نہیں — مزہ تو کھیلنے میں ہے۔ — اور دیکھو مجھ سے کھیلتے ہوئے گر پڑو یا چوٹ لگ جائے تو رونا نہیں، منہ بسورنا نہیں — میرا کھیل مردوں کا کھیل جو ٹھہرا —

ارے — بڑے شریر ہو — بھاگ کھڑے ہوئے! اچھا تو باقی میدان میں — اچھا —

اچھا!

اوپر سے نیچے
نعیم
ضمی

تصاویر کے لیے شکریہ

۱۔ پریس انفارمیشن بیورو، وزارتِ اطلاعات و نشریات، نئی دہلی
۲۔ جناب خالد انصاری، ایڈیٹر اسپورٹس ویک، بمبئی
۳۔ جناب مہندر سنگھ ایڈیٹر "کھیل کھلاڑی"، نئی دہلی
۴۔ ایڈیٹر اسپورٹسل، نئی دہلی
۵۔ آئی۔ ٹی۔ ڈی۔ سی۔ نئی دہلی

ساتویں باب کے لیے ماضی کے فٹ بال کھلاڑیوں کے حالات، میرے محترم دوست ڈاکٹر جاوید نہال صاحب نے عنایت فرمائے۔

شکریہ :-

نریندر نشچل کا، جن کی معاونت اور مشوروں کے بغیر یہ کتاب شاید ادھوری رہتی۔

تصاویر کے لیے شکریہ

۱۔ پریس انفارمیشن بیورو، وزارت اطلاعات ونشریات، نئی دہلی
۲۔ جناب خالد انصاری، ایڈیٹر اسپورٹس ویک، بمبئی
۳۔ جناب مہندر سنگھ ایڈیٹر "کھیل کھلاڑی"، نئی دہلی
۴۔ ایڈیٹر اسپورٹسل، نئی دہلی
۵۔ آئی۔ ٹی۔ ڈی۔ سی۔ نئی دہلی

ساتویں باب کے لیے ماضی کے فٹ بال کھلاڑیوں کے حالات، میرے محترم دوست ڈاکٹر جاوید نہال صاحب نے عنایت فرمائے۔

شکریہ :-
نریندر نشچل کا، جن کی معاونت اور مشوروں کے بغیر یہ کتاب شاید ادھوری رہتی۔

نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا